خلافت لائبریری

جنوری 61

جنوری 1961ء

برائے:- خلافت لائبریری - ربوہ

10
3-4

جنوری 61

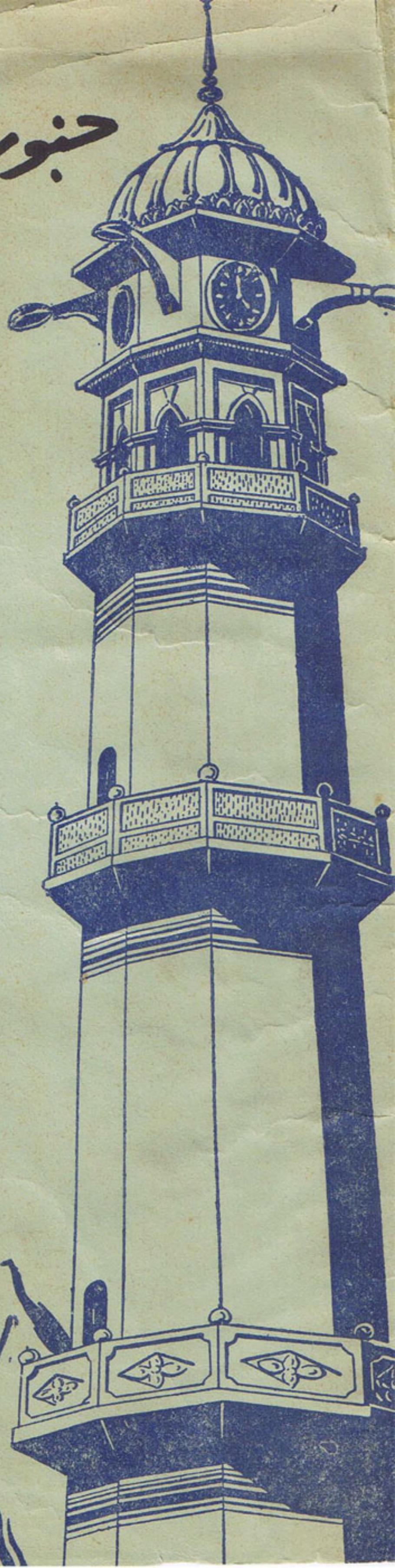

المنار

خلافت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وممن خلقنا امة یھدون بالحق وبه یعدلون

(قرآن کریم سورہ اعراف)

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

علم و عمل

نگران

محمد شریف خالد ایم۔ اے

مدیران

کلیم اللہ خان

مرزا محمد الیاس

جلد ۱۰ — جنوری سنہ ۱۹۶۱ء — شمارہ ۳

پرنٹر پبلشر:- اے۔ ایم۔ حمید ہاشمی ☆ مطبع:- ضیاء الاسلام پریس ربوہ

ترتیب

اداریہ	مرزا محمد الیاس	۳
تأثرات	لطف الرحمٰن محمود	۴
نقطۂ نظر	کوہستانی	۵
غزل	ایس۔ ایم۔ احمد	۹
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ	مظفر جاوید	۱۰
آہ!!	سعید بٹ	۱۲
"دیوان ہے ہمارا کیسر جواہری کا"	کلیم اللہ خان	۱۶
غزل	طارق سعید طاہر	۲۲
پہاڑوں کے آس پاس	زرتشت منیر احمد خان	۲۳
ہمارے کالج میں کشتی رانی	مبشر احمد بدھو	۲۶
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سفر کی دعا	مولانا ابوالعطاء صاحب	۲۹
غزل	سعید بٹ	۳۰
غالب کا استغراق (اگزیما)	جمشید ہاشمی	۳۱
یہ آنسو یہ تڑپتے دل کی فریاد	ملک منصور احمد عمر	۳۵
ساقی کوثر کے حضور (نظم)	حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل	۴۱
غزل	لطف الرحمٰن محمود	۴۲
"	مصلح الدین احمد راجیکی مرحوم	۴۳
"	محمد شریف خالد ایم۔ اے	۴۴
"	مبشر احمد راجیکی	۴۵
"	ملک عبدالباسط خادم	۴۶
اے ٹی۔ آئی کالج ......!	ہادی مونس (ٹی۔ ایڈ)	۴۷
غزل	انور شاہ ارشد	۴۸

مدیر: اعجاز الیاس

اداریہ

المنزل کے نئے دور کا دوسرا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بہتر ہے؟ یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ ہمیں اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا اعتراف رہا ہے۔ لیکن کون ہے جو اپنی دلی خواہشات کو مکمل صورت میں پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟

المنزل برادرم لطف الرحمٰن صاحب محمود کا احسان مند رہا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ وہ ابھی اسے نہیں بھولے۔ اُن کے تاثرات کالج کے ماحول سے اُن کی گہری دلچسپی کے شاہد ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہ آئندہ بھی اس قسم کے مشاہداتی مضامین سے المنزل کو مستفید فرماتے رہیں گے۔ بحیثیت مجموعی شمارہ کیسا ہے اور کیسا ہونا چاہیئے؟ ہمیں اس بارہ میں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

کالج کے شب و روز ایک انسان کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ہر ایک کو مستقبل کے دھندلکوں میں چھپے ہوئے امتحانات سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ جب مستقبل حال بن جائے گا اور زمانے کے طاقتور ہاتھ زندگی کی کتاب میں پڑھے ہوئے اسباق کا امتحان لیں گے تو کالج کی چار دیواری میں چھپے ہوئے امتحانات ہمارے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں گے۔ تب یہاں کی کامیابیاں ہمیں انتھک محنت کے فوائد یاد دلائیں گی اور ناکامیاں ــــ مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنا سکھائیں گی۔ کاش کہ ہم میں سے ہر ایک امتحانات کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر اس وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائے ــــ

لطف الرحمٰن محمود

تأثرات

پُرانے چہرے!

بزرگوں کا وجود برکت کا موجب ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض بابرکت وجود ہر سال تبرک کے طور پر محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔ کچھ وجود یہاں ہی دھر لئے جاتے ہیں اور کچھ اُدھر سے آتے ہیں۔ اُدھر سے آنے کا یہ مطلب نہیں کہ آسمان سے ٹپکتے ہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ بورڈ یا یونیورسٹی برکت پھیلانے کے لئے انہیں ازراہِ ترحم واپس کر دیتی ہے۔ ایسے بابرکت وجودوں کو "پُرانے چہرے" کہہ لیجئے! ہمارے کالج میں بھی ان وجودوں کی نعمت موجود رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ایسے بابرکت وجود اب بھی بکثرت موجود ہوں گے مگر افسوس کہ اکثر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں یعنی نکل گئے ہیں۔ باقی جو ہیں وہ خلوت میں "سلوک" کی منزلیں طے کر رہے ہیں! اور بہت تھوڑے ہیں جو ہنوز جلوت کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ کچھ اپنے خاص ساتھی بھی تھے مگر خزاں کے سوکھے پتوں کی طرح بکھر چکے ہیں! لے دے کے ایک ہی ایک وجود نظر آتا ہے جو اب تک ماشاء اللہ قائم ہے! اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم انہی پرانے بزرگوں میں سے ہوں! اتنا ضرور ہے کہ ان میں سے اکثر کی میں نے زیارت کی ہے۔ افسوس کہ میں نے ان بابرکت وجودوں کی صحبت سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ ان وجودوں میں سے ایک وجود تو نہایت ممتاز مقام پر فائز تھا۔ یہ بزرگ گزشتہ [illegible] کی یادگار تھے۔ یعنی اس کالج کی ابتدا کے ساتھ ہی ان کی کالج لائف کی ابتدا ہوئی ——— پچھلے سال تک تو وہ "بقیدِ حیات" تھے! اس سال شاید گزر گئے ہیں! میں یہ بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کتنے پائے کے بزرگ تھے! مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اُن کا وجود کالج کی چلتی پھرتی بنیادی اینٹ تھی! افسوس وہ اینٹ اب ہمارے قبضے سے نکل گئی ہے! یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ زندہ قومیں یادگاروں کے سہارے جیتی ہیں اور یقیناً وہ ایک "تاریخی یادگار" تھے۔ آپ کے علاوہ بعض اور وجود بھی تھے جو ہوسٹل کے عجائب گھر میں کافی مدت سے محفوظ چلے آتے تھے! افسوس کہ میری غیر حاضری میں بر فواد "رضائے" ہو چکے ہیں! میں نے کالج اور ہوسٹل کے سارے بلاک بڑی بے چینی سے چھانے ہیں۔ چشمِ بد دُور خوب رونق ہے مگر "تاریخِ قدیمہ" کا خلا کچھ ایسا لمبا چوڑا ہے کہ اس کے پُر ہونے کی توقع نہیں! جو تھوڑے سے بہت پُرانے چہرے ہیں اُن میں لئے ان بزرگوں اور ساتھیوں کی روح موجود نہیں! اُن کی یاد سے آج بھی میری روح گداز ہو رہی ہے ~

زمانہ کھنچتا جاتا ہے نظر سے
لئے جاتی ہے یادِ رفتگاں دُور!

نئے چہرے

بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ کیا کہنے ان نئے لوگوں کے! ان کے چہروں کی بجائے (باقی صفحہ ۳۹ پر)

نقد و نظر

تاجپوشی

یونین کے انتخاب کا حال تو آپ پچھلے شمارہ میں پڑھ چکے ہیں ذرا اس کی "تاجپوشی" کا حال بھی سن لیجئے ——

ابھی کالج میں داخل ہی ہوئے تھے کہ یاروں نے "کوہستانی" کو اس طرح گھیر لیا جس طرح کنول کو لالہ بیلیں —— اور لگے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے اور باتوں کا تانتا باندھنے —— عقل چرخ میں آگئی کہ معاملہ کیا ہے —— بھلا سمجھ آتی بھی کیسے باتوں کی کھچڑی ہی تو پک رہی تھی —— جب پریشانی پیشانی تک پہنچ گئی تو سعید بٹ سے نہ رہا گیا اور پیٹ سے اگل دیا —— کہ "یونین کی تاجپوشی ہے آج" —— گیلری میں ہر کوئی خوش و خرم دکھائی دیتا تھا —— اک زندگی کی رمق تھی، لہر تھی اور نئی تھرک —— خلا کے شگوفے رلینہ یا لمبے قہقہے —— دلفریب مسکراہٹیں، اور رنگ برنگے چٹکلے اور مسکراہٹیں پھڑپھڑاتے سنائی دیتے تھے —— آخر مدت کے بعد "دوشیزہ یونین" نے انگڑائی لی تھی اور عنقریب اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہونے والی تھی —— یونین کی جو مدت سے سوکھی پڑی تھی نئی رنگینیوں سے بھرنے والی تھی —— وہ جس کے جل تھل سے کالج سیراب و شاداب ہوتا ہے —— اور زندگی کی جولانیاں عود کر آتی ہیں —— ساڑھے گیارہ بجے طلباء اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے —— رسم تاجپوشی کے تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے —— کوہستانی اسمبلی ہال میں عین اس وقت داخل ہوئے جب زر دیپ مسکرانے والا تھا —— تاج دیکھنے والا تھا —— تمناؤں کے لالہ زاروں میں بہاروں کے نغمے بکھرنے والے تھے —— یونین کی انگڑائی سے یقین محکم اور عمل پیہم کے چشمے ابلنے والے تھے —— اور یونین کی غنچہ بندی مسکرانے والی تھی ——

اچانک صدر دروازہ سے یونین کے صدر ڈاکٹر شاہد صاحب اور پرنسپل صاحب اپنے سرخ و سیاہ خلعتوں میں شاہانہ شب خرامان خرامان دراآئے اور پیچھے پیچھے دوسرے عہدہ داران قطار اندر قطار —— اور ایک دلکش انداز میں اپنی نشستوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے —— اس دوران تمام طلباء باادب خاموش کھڑے رہے —— صدر صاحب کے تشریف رکھنے پر تمام طلباء بھی بیٹھ گئے —— ان کے بعد تلاوت قرآن ہوئی اور پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنی نئی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور طلباء سے اپنی گزشتہ کوتاہیوں کو بالائے طاق رکھنے اور نئے عزم و استقلال سے کام کرنے کی اپیل کی —— اس کے بعد نائب صدر نعیم طاہر صاحب کو دعوت دی کہ وہ کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوں —— آپ کی تشریف آوری پر حاضرین ایک بار پھر احتراماً کھڑے ہو گئے —— آنکھ جھپکنے کی دیر تھی کہ نعیم طاہر صاحب کو طلباء نے کرسی صدارت پر بیٹھے دیکھا —— صدر صاحب اور سیکرٹری صاحب کو سرخ و زرد خلعتوں میں ملبوس دیکھ کر لامحالہ پرندوں کی

بادشاہت کا شک پڑتا ـــــ اور شہزادی بلقیس کے دربار کا گمان ـــــ کوہستانی نے ابھی مدعا عرض کرنے کے لئے پر پھڑپھڑائے ہی تھے کہ ماحول کی شان و شوکت اور دربار کے رعب و داب کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ تمام پر بکھر گئے اور جسم ساکن ہو کر رہ گیا ـــــ

خدا جھوٹ نہ بلوائے اس وقت تو کوہستانی کو یوں معلوم ہوا تھا جیسے کہیں سے کوئی غولِ بیابانی گردشِ ارض کی اس گھڑی پر اُتر آیا ہے اور دربار آراستہ کیا ہے۔

کوہستانی سُرخ و زرد رنگ کے امتزاج کو بغور دیکھتا رہا ـــــ کوہستانی بھلا اس کے سوا کیا تحفہ دے سکتا تھا ـــــ بڑھ کر آرزو دل اور امیدوں کا سہرا ان کے سر باندھا ـــــ اُدھر صدر صاحب نے اپنے عملے کا تعارف کرایا مگر کوہستانی اپنے پر جھٹے خیالات کے اُس چمن میں گُل چینی کرتا رہا، جہاں عملِ پیہم کے فوارے نغمۂ یقینِ محکم سے ہمراہ ہے ـــــ جہاں قوسِ قزح کی رنگینیاں تھیں ـــــ طلبار کی غوغا آرائیاں اور رعنائیاں ـــــ جہاں پھول تھے پھولوں کی مہک تھی ـــــ اور کلیوں کا گداز تھا اور چٹکنے کا غل ـــــ

تعارف کے بعد صدر صاحب نے الفاظ کے پھولوں سے عہد و پیمان کی ایک مالا جوڑی اور سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کرنے کا یقین دلایا ـــــ مجلس کے اختتام کے اعلان پر یونین کا ترانہ اُس مخصوص انداز میں واپس ہونے لگا ـــــ اس دوران طلبار باسلیقہ، باادب کھڑے رہے ـــــ . . . . . اس کے بعد اداس دل میں ڈوبا ہوا ماحول ہچکولے کھانے لگا ـــــ

دیگر مجالس

صاحبِ وفاداری اٹھانے کے بعد یونین کی اٹھان یقیناً نیک شگون ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ آل ربوہ مباحثہ کروا دیا ـــــ دوسرے کاموں میں تو خیر درد سری کرنی ہی پڑتی ہے مگر اس دفعہ تو شاید عنوان کے انتخاب میں بھی کافی ذہنی کاوش کرنی پڑی ہی ـــــ خوب عنوان تھا "اقوام کی ترقی افراد کی نہیں نظریات کی مرہونِ منت ہے" ـــــ تعلیم الاسلام ہائی سکول اور جامعہ احمدیہ کے مقررین نے بھی حصہ لیا ـــــ کوہستانی مباحثہ کا رنگ دیکھ کر دنگ رہ گیا ـــــ اور سوچتا رہا کہ کالج کے اکثر مقررین نے تقریر کرنے کی بجائے تحریر پڑھنے کی اس بھری مجلس میں کیسے جسارت کی ؟ اور اس طرف توجہ دلانے کے باوجود صدر صاحب نے "فراخدلی" کا ثبوت دیا ـــــ یہ تو خیر گھر کی بات تھی، لیکن اگر ایسی "ہشیاریاں" باہر کے مقابلوں میں گئیں تب معلوم ہوگا کہ وہاں "کس بھاؤ بکتی ہے" ـــــ اگر مقرر مقالہ نگار کہتے ہیں تو پھر خدا انہیں سمجھے ـــــ اور ہمیں گوشۂ نشینی عطا کرے ـــــ

کوہستانی کوئی کوسنے کی غرض سے حقیقت کی نقاب کشائی نہیں کر رہا بلکہ "یونین" کے "یوں ہی" پھرنے اور حالات کا خیال نہ کرنے کی طرف طلبار کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے ـــــ اور اس طرح یونین کے گوش گزار کرنا چاہتا ہے کہ "یوں" کا عرصہ بیت گیا ـــــ اور اس قسم کی تمام رسموں کا اجرا، اجرا کا مستحق نہیں بلکہ سزا کا مستحق ہے اسلئے کہ کر اسے پہ پانی پھیرنے والے اور ناک کٹوانے والے اقدامات سے پرہیز کرے ـــــ یہ کوئی اکڑ دھکڑ نہیں بلکہ مخلصانہ مشورہ ہے اگر یونین اسے پلّے میں باندھ لے تو یقیناً اس کے لئے مفید ہے ـــــ

"شاید اُن کے دل میں اتر جائے میری بات"

◄ پوچھتے ہی مرغِ سحر اذان دیتا ہے اور کلی کے چٹکتے ہی حُسن مسکراتا ہے ـــــ اسی طرح یونین کی پوچھتے ہی دیگر مجالس نے

بھی ایک طرف تحریر ہونے کا اعلان کیا تو دوسری طرف اپنی بیداری اور تحسین کا ذکر دگنی کا ——

یونین کے بعد سائنس سوسائٹی "سرپرست" آتی ہے —— بھلا یہ کب پیچھے رہنے والی ہے —— اس کی ہر چیز میں عجلت ہے، جدت ہے —— اور جدوجہد جاری و ساری —— کومستانی نے لگے ہاتھوں شیخ مبشر صاحب سے پوچھا "کیوں بھئی! کب تک سائنس سوسائٹی، سائنس بند کرکے یونہی سوتی رہے گی" —— ہنس کر فرمانے لگے —— "جی! آپ کے ابا حضور چاہتے ہیں کہ پہلے یونین "رجسٹرڈ" ہو جائے پھر کہیں کوئی قدم اٹھائیں، مبادا کوئی نام رکھ دے —— اور اس سے پہلے کچھ کرگزرنا شاگرد کا استاد کے آگے چلنے کے مترادف ہے" ——

خیر جونہی یونین کو اختیار نامہ ملا، سائنس سوسائٹی کو بہت خلا اور برق رفتاری سے ایک نہایت ہی اہم اور دلچسپ لیکچر کا اہتمام کر ڈالا —— لیکچرار تھے پروفیسر نصیر احمد خان صاحب اور آپ کا عنوان تھا "ایٹم فار پیس" (Atom for Peace) —— اس لیکچر کو ربوہ کی کثیر تعداد نے سنا اور اپنے علم میں اضافہ کیا —— آپ نے نہایت محنت سے یہ لیکچر تیار کیا اور اہم باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے بے شمار نقشہ جات اور "موڈل" (Model) تیار کروائے —— "موڈل" بجلی سے کام کرتے تھے اور اپنی برق رفتاری کا ثبوت دیتے تھے —— اسی طرح کئی اہم پہلوؤں کو مختلف سلائڈز (Slides) دکھلا کر واضح کیا گیا —— آخر میں عام سوال جواب کے دوران ہم جیسوں نے بھی علم کے موتی اکٹھے کئے ——

اگر سائنس سوسائٹی ایک دو لیکچر اس قسم کے کروانے کا بندوبست کرے تو وہ یقیناً کامیاب ہے —— ۲۴ نومبر کی بات ہے کہ یہ سوسائٹی پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب اور سعید اللہ خان صاحب کی زیر نگرانی لاہور سے "ایٹمی نمائش" کا جائزہ لے کر آئی ہے —— اور کومستانی نے اُن کے تأثرات اکٹھے کئے ہوئے اِس امر پہ پہنچاتے ہیں کہ اگر سائنس سوسائٹی انہیں یہ موقع بہم نہ پہنچاتی تو وہ یقیناً ایک اہم درس سے محروم رہ جاتے ——

؎ "مائل اوجِ ترقی ہے ترا پیکِ خیال"

● موقع سے فائدہ نہ اٹھانا محض نادانی ہی نہیں میرے نزدیک بے وقوفی ہے —— ایسا ہی موقع انصارو الاولی کو اللہ اللہ کرکے مل گیا جس سے پورے طور پہ فائدہ اٹھا کر مجلس ارشاد نے اچھی خاصی کروٹ لی —— شکر ہے اب کچھ سعید روحیں صحیح راستے پر گامزن ہو جائیں گی —— اور کئی سلیم عقلیں ان مواقع سے تسکین قلب حاصل کریں گی —— ۱۷ نومبر کو صوفی بشارت الرحمٰن صاحب نے ایک گرانقدر مقالہ "مسلم نوجوانوں کے لئے بعض قرآنی ہدایات" پڑھا —— صدارت کے فرائض مولانا ابو العطاء صاحب نے سرانجام دیئے —— صوفی صاحب کا تھوڑے سے وقت میں اتنے اہم اور وسیع مضمون کو بالتفصیل بیان کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے سے کم نہیں —— قارئین اس کی تفصیلی رپورٹ الفضل میں پڑھ چکے ہیں ——

● اکنامکس سوسائٹی بھلا یہ کب برداشت کر سکتی تھی کہ اسے "اِکس نامکس" سوسائٹی کہہ کر الگ پھینک دیا جائے، وہ تو "بکس" ہو کر "اکنامکس" بننے کی دعویدار ہے —— پھر بلا کی

ہوشیار ہے" اسی ماہ ایک لیکچر کا اہتمام کر کے اپنے دعوے کا ثبوت ہماری عقلوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی کہ "میں بھی تم سے 'ایکسٹرا' ہوں اور غیر نہیں ہوں" ——— خدا جانے یہ کڑی کا ابال ہے ——— یا بڈھوں کا خیال ———

کوہستانی کو بھنک پڑ گئی کہ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اختر صدر شعبۂ اکنامکس پنجاب یونیورسٹی کو بلا کر لیکچر کروا لیا۔ "اکنامکس" والوں کا ہی کام ہے ——— آپ نے اپنے پُر از معلومات لیکچر میں یہ بھی واضح کر دیا کہ چند سالوں میں انشاء اللہ پاکستان خوراک میں خود کفیل ہو جائے گا اور موجودہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔ کوہستانی کے منہ پر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں ——— کیونکہ ع

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

اس سوسائٹی کا اس طرح کبھی کبھی اجلاس کرنا "اکنامکس" کو سمجھنے پہ دلالت کرتا ہے اور "اکنامکس" ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے ——— اسلئے کوہستانی مجبوراً اس کو دیگر سوسائٹیوں سے "ہٹ کر" کہہ دیتا ہے۔

ٹورنامنٹ

ابھی کل ہی ایک ٹورنامنٹ کھیل کر لاہور سے واپس آئے تھے کہ معلوم ہوا کہ سرگودھا زون کے تمام میچ یہیں ہو رہے ہیں اور بورڈ کی ٹیمیں کل کچھ میچ کھیل چکی ہیں اور آج فائنل میچ ہوں گے ——— کوہستانی فوراً باسکٹ بال کی گراؤنڈ میں پہنچا اور رضوان صاحب کو آرڈر نافذ کرتے دیکھا ——— آپ نے فوراً کئی کام سپرد کر دیئے۔ ہم تو خدا سے ایسا موقع چاہتے تھے کہ باسکٹ بال کو اپنی خدمات پیش کریں، چنانچہ کھٹا پٹ کام کئے اور خوشی سے موسٹ ہو گئے ——— پہلے والی بال کا میچ ہوا ——— اسکے فوراً بعد باسکٹ بال کی ٹیمیں گراؤنڈ میں پہنچ گئیں ——— کھیل بڑی گرمجوشی سے کھیلی گئی ——— یاروں نے خوب "بک اپ" کی! ادھر میاں صاحب کا مووی کیمرہ کھلاڑیوں کی تصویریں لینے میں مصروف رہا ——— ہمارے کھلاڑیوں میں سے سعید، خالد، امین اور رضوان نے نہایت عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا اور گورنمنٹ کالج سرگودھا کو شکست فاش دیکر زونل چیمپین شپ (Zonal Championship) جیت لی ——— اس کا سہرا انچارج نذیر احمد خان صاحب کے سر ہے جنہوں نے نہایت خلوص، جوش، باقاعدگی اور جانفشانی سے ٹیم کو مشق کرائی ——— اس کے بعد ۳ بجے ٹی۔ آئی کالج اور گورنمنٹ کالج جھنگ کے درمیان فٹ بال کا میچ ہوا ——— خوب ڈٹ کر مقابلہ ہوا مگر کسی طرف گول نہ ہوا ——— آخر کسی اور تاریخ کے لئے ملتوی کر دیا گیا ——— آخر میں میچ کے قریب محترم پرنسپل صاحب نے انعامات اور اسناد تقسیم کیں اور ٹورنامنٹ بخیر و خوبی ختم ہوا ———

چھٹی

ٹورنامنٹ کے انعامات تقسیم کر کے محترم میاں صاحب ابھی گراؤنڈ میں ہی تھے کہ لڑکوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ "چھٹی چھٹی" ——— چھٹی کے ہر لفظ سے کوہستانی کے دماغ پر چوٹ سی پڑنے لگی ——— وہ حیران تھا کہ چھٹی کس بات کی مانگی جا رہی ہے ——— وہ سمجھتا رہا کہ ان کے یہ نعرے خلاؤں میں ہی گھل جائینگے اور وہ ابھی تتر بتر ہو جائیں گے ——— مگر لڑکے آخر لڑکے ہی ہوتے ہیں ——— میاں صاحب کے پیچھے پیچھے کوٹھی تک پہنچ گئے ——— اور دھما چوکڑی اور شور و غوغا مچا دی

رہا ـــــ کوہستانی کو یہ بات بہت گراں گزری ـــــ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو ان سب چھٹی مانگنے والوں کو کیا نہ کر دیتا ـــــ کوہستانی غصے سے لال پیلا ہو گیا، چاہتا تو تھا کہ ان چھٹی مانگنے والوں کی گردن ناپے کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آجائے ـــــ مگر چھٹیاں بھیج کر دیا گیا ـــــ لڑکوں کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں گرد آلود آئینہ کی طرح بے رونق ہو گئیں لیکن بچھو سے چپکے رہے ـــــ آخر ایک بار کو پکڑ کر کہہ دیا: "میاں! تمہیں چھٹی سے کیا ملے گا؟" اس پر وہ بھی گرم ہو گئے اور کہنے لگے "واہ چھٹی میں مزے کریں گے" ـــــ اس پر کوہستانی نے یہ شعر پڑھ دیا ؎

"وہ کبھی سنجیدگی سے تو نے سوچا ہی نہیں شاید
تمہارا ہی خون ہے تیری نوشی کے آبگینے میں"

اور ساتھ ہی جڑ دیا کہ کیا تم اپنے وقت کا خون پینے کے لئے تیار ہو ـــــ اس پر وہ دوڑ گئے اور وہی رٹ لگانی شروع کر دی ـــــ اور یہ تمام لیکچر ہوا میں تحلیل ہوتے رہے ـــــ آخر میاں صاحب تنگ آ گئے اور پیچھا چھڑانے کیلئے ایک ایک چھٹی دے ہی دی ـــــ بھلا آئے دن ان چھٹیوں کا کیا فائدہ ـــــ وقت تو ہمارا اپنا ضائع ہوتا ہے ـــــ کالج کا کیا نقصان ـــــ کوہستانی امید کرتا ہے کہ طلباء اس رسم بد کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے اور ایک نئے دور کا آغاز کریں گے ـــــ ورنہ جانی نقصان ہر لحاظ سے خربوزہ کا ہی ہوتا ہے ؎

"بگوشِ ہوش سنو ہم سنائے دیتے ہیں"

ایل۔ ایم۔ احمد
(سال سوم)

اُس بُت کو بھی رام کیا تھا
جس نے زیرِ دام کیا تھا

دہر میں جب نایاب تھا عشق
دیوانوں نے عام کیا تھا

آج ہے وہ بھی آنکھ سے اوجھل
جس کا جلوہ عام کیا تھا

ذوقِ سفر بھی یاد ہے مجھ کو
سجدہ ہر اک گام کیا تھا

ہم کو بھی چاہت نے دل کی
گلی گلی بدنام کیا تھا

زلف کے سائے میں ہم نے بھی
کتنی دیر آرام کیا تھا

زہر بھرا محمود کو ساقی
تُو نے پیش اک جام کیا تھا

مظفر جاوید
سالِ دوم (سائنس)

"پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ"

زندگی کا وسیع و عمیق سمندر نہایت متانت و سنجیدگی سے بہہ رہا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ لہریں اور موجیں اس کے وسط، اطراف و اکناف میں متلاطم ہیں۔ خوش رنگ و خوش لون مچھلیاں پانی کی سطح، تہ اور گود میں کھیل رہی ہیں۔ مگر مچھ اور دیگر جانور بھی اسی آبی دنیا کے مکین ہیں۔ اس مختلف الانواع مخلوق کا ایک جمِ کثیر اس کے مختلف زاویوں اور کونوں میں قیام پذیر ہے ان میں عموماً باہمی کشمکش رہتی ہے۔

زندگی کی اکثر مسرتوں سے اُن کے قلوب بھرپور ہیں۔ اور سنہری مچھلیاں کھیل کود اور اٹھکیلیوں میں مستغرق ہیں۔ مگر بسا اوقات بے چاری سہم بھی جاتی ہیں۔ جبکہ متحرک پہاڑ نما موجیں انہیں تھپیڑے مارتی ہیں۔ تھپیڑوں پہ تھپیڑے تو یہ بیچاری کھاتی ہیں مگر پھر بھی پُرکیف زندگی کا تصور انہیں تھامے رکھتا ہے لیکن ان کی تکالیف محض تھپیڑوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مچھیرے کا دام ان کی زندگی کے اختتام کا پیغام لاتا ہے۔ بے چاری شکم پرستی کی عادت میں شکم سیر کرنے کی غرض سے دام کا شکار ہو ہی جاتی ہیں۔

بعض سنہری ہیں، بعض قرمزی، بعض کھجوری اور خاکی ان کا اختلاف انواع پانی کے تاثرات کا نتیجہ ہے۔ جغرافیائی ماحول کا یہ اثر قبولیت سے خالی نہیں ہوتا۔

یہ سمندر میرے سامنے بہہ رہا ہے۔ ادھر موت اپنا بھیانک منہ کھولے کھڑی ہے۔ اس کا بدشکل چہرہ نظر آ رہا ہے۔ اس کے منہ کے اندر کے تیز تیز اور لمبے لمبے دانت خوفناک سے بھرپور ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت ابھی نوالہ بنا دے گی۔ مگر امیدوں اور امنگوں کا ایک ایسا پردہ نظروں کے سامنے اور موت و حیات کے درمیان پڑا ہوا ہے کہ میں یہی خیال کرتا ہوں کہ زندگی سے موت کی طرف جانے والے راستے میں امنگیں موتیوں کی طرح بچھی ہوئی ہیں۔ خیال آتا ہے کہ موت کی وادی میں پہنچنے سے پہلے ان تمام امیدوں کے موتیوں کو چن لیا جائے۔ مگر ان کا چناؤ .... اگر ان کی چمک دمک اور خوبصورتی نہ ہوتی تو پھر موت اور زندگی کی دونوں وادیوں کے درمیانی فاصلے کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ دراصل ان خواہشاتِ مستقبل نے ہی اپنے مضبوط بازوؤں سے پردہ مذکورہ وادیوں کو الگ الگ رکھا ہے اور ان کے باہمی ملاپ کو ایک وقتِ مقررہ تک ناممکن بنا رکھا ہے

میں ان وادیوں کے درمیان تن تنہا کھڑا ہوں۔

اغلباً وادیٔ موت سے میرا فاصلہ وادیٔ حیات سے زیادہ قریب ہے۔ تاہم مستقبل کی نیرنگیاں جو کہ مستور ہیں اُن کی چمک دمک نے حوصلہ افزائی کر رکھی ہے۔ اور اس فاصلہ مذکورہ کی حقیقت کو دھندلا کر رکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ میں کتنے موتی چن لوں گا اور بقایا کتنے رہ جائیں گے؟

فطرت نے نہیں بلکہ فطرت زادوں نے اتنے کانٹے بچھائے ہیں کہ انہوں نے میرے دست و پا کو چھلنی کر دیا ہے،

میرے چلنے کا راستہ کوئی پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کی کوشش تلاش نہیں کیا سکتی جبکہ پاؤں کے تلووں سے بہنے والا سُرخ رنگ کا خون راستہ نمائی کرتا ہے۔ لہذا میرے راستہ کی پوشیدگی پوشیدگی رہ ہی نہیں سکتی۔ بلکہ راستہ پر میرے پاؤں کے خونی نشانات تا بقائے عالم میرے راستہ کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ اور اگر موتی حاصل نہ کر سکا تو اُن کے رگ و روح میں ہاتھ کے زخموں سے بہنے والا خون اس بات کی شہادت تا قیامت دیتا رہے گا کہ کسی عاصی کا ہاتھ اُن کے پُردوں تک پہنچا تھا۔ پھر خیال آتا ہے کہ قدرت نے ہاتھوں کی رسائی جواہرات تک ممکن کر دی تو پھر بھی انہیں اُٹھاتے وقت جھجکوں گا۔ اس خوف و ہراس سے کہ کہیں ہاتھوں سے بہنے والا خون موتیوں کی خوبصورتی پر بدنما داغ نہ لگا دے کہیں عاصی ہاتھوں کے خون کو معصوم موتیوں کا خون نہ سمجھ لیا جائے

اے قادرِ مطلق! تیرے سامنے زمان و مکان کی قید بے بنیاد ہے، ممکن و ناممکن، حیات و ممات، سرعت و تاخیر، غرضیکہ کسی موافق و متضاد کی کوئی حیثیت نہیں۔ تُو جو چاہے کر ڈالے، جب چاہے کر دے۔ جس کو چاہے بخش دے۔ تیری اس قدرتِ بے مثل سے استدعا کرتا ہوں کہ مجھ جیسے بے سہارے اور عاصی کو پناہ دے۔

جب تیری قدرت کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کرتا ہوں تو وادی موت اتنی دُور نظر آتی ہے کہ ہر موتی تک رسائی کو ناممکن سمجھتا ہوں۔

انور شاہ ارشد
(بھرڈ ایر)

پارہ ہائے دانش

زہے عشق و دولت کہ دجامی ز عشقِ تو
بلبلے عاشق ندارد مذہبے بجز ترکِ مذہبہا

من نالم از جدائی تو دم بدم چو نے
ویں طرفہ تر کہ از تو نیم یک نفس جدا

(جامی)

نہ چناں گرفتہ جا بمیانِ جانِ شیریں
کہ تواں ترا و جاں را ز ہم امتیاز کردن

ہیچ اکسیر بہ تاثیرِ محبت نرسد
کفر آوردم و در عشقِ تو ایماں کردم

(نظیری)

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

سعید بٹ
(سالِ چہارم)

آس!!

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

وقت ۔ دورانِ جنگِ عظیم دوم۔

کردار ۔ شبیر محمد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عمر بیس سال۔

نصیبن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شبیر محمد کی ماں ۔ عمر تقریباً پچاس سال

فاطمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شبیر محمد کی چچی اور ہونے والی ساس۔

منظر ۔ ایک تاریک سا کمرہ ہے۔ جس کی دیواروں سے مٹی مسلسل گرتی رہتی ہے ——— چند چارپائیوں کے علاوہ ایک پرانی سی میز بھی پڑی ہے۔ میز پر ایک مٹی کا چراغ رکھا ہُوا ہے ——— دیگر گھریلو استعمال کی چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں ——— ایک چارپائی پر ایک اندھی عورت بیٹھی ہوئی ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے۔

فاطمہ ۔ (اندر داخل ہوتے ہوئے) بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سُنا تم نے بھی۔ میرا دل تو سُن کر باغ باغ ہُوا جا رہا ہے۔

نصیبن ۔ آؤ فاطمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی اچھی خبر ہے تو سُناؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی سُناؤ میری بہن ۔ آنکھیں تو لختِ جگر کے فراق میں بُجھ گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کان ہیں کہ ہر آہٹ پہ چونک اُٹھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید میرے لال کے قدموں کی دستک ہی آہٹ ہو۔

بھیانک مُنہ کھولے (ہنس کر) بلا ہی مرسے نکل جا رہی ہے ۔ حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کا نور بھی فراقِ یوسفؑ میں بُجھ گیا تھا ——— مگر وصالِ لال پہ دوبارہ جل اُٹھا تھا۔ مجھے امید ہے تیری اندھیری دنیا میں تیرا چاند بیٹا صبحِ نو کی کرنیں لے کر آئے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو تجھے سب کچھ نظر آنے لگے گا۔

نصیبن ۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) تُو تو ہنس رہی ہے مگر موا کلیجہ مُنہ کو آ رہا ہے۔ آجکل نہ جانے کیوں بڑے ڈراؤنے خواب آ رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ خیر کرے میرے بچے پہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے لال کی رد بلائیں۔

فاطمہ۔ اری یہ کیا؟ ..... ہائے ہائے نصیبِ دشمناں۔
اری میں تو تجھے خوشخبری سُنانے آئی تھی۔ لے ....
یہ دیکھ تیرے لال کا خط ...... ذرا آنکھوں سے
تو لگا — میں بھی دیکھوں تیری آنکھوں میں نور آتا
ہے یا نہیں۔

نصیبن۔ (خط کو سینے سے لگا کر) یا اللہ .... یا مولا تیرا
صد شکر ہے — اری کیا لکھا ہے میرے لال
نے — جلد بتا — بتا بھی دے میری
اچھی بہن — ......

فاطمہ۔ یوں نہیں ..... پہلے منہ میٹھا کراؤ — تب
سُناؤں گی۔

نصیبن۔ اری سُنا بھی دے — میں میٹھے میں تجھے نہلا
دوں گی — اب جلدی بتا دے —

فاطمہ۔ (خط کھولتے ہوئے) لے سُن ..... تیرا لال
اب فوج کی نوکری پر تھوک کر ہمیشہ کے لئے آ رہا
ہے۔ لکھتا ہے:-

"میری پیاری ماں ..... میں آ رہا
ہوں — کیونکہ سرکار نے مجھے ہمیشہ
کے لئے چھٹی دے دی ہے۔ سرکار
کی ہم نے بہت خدمت کی ......
یہاں تک کہ سرکار نے ہمیں بیکار جانتے
ہوئے ہماری خدمات کے عوض تھوڑی
سی بخشش دے کر آزاد کر دیا — مگر
در بدر وہ پھریں جن کے ماں باپ نہیں۔
اماں ..... تمہیں میں ایک مدت
سے خط نہ لکھ سکا۔ تمہیں میرے متعلق
ان ایام میں ضرور تشویش رہی ہوگی،
— مگر اماں ..... یہ جنگ
جہاں زندگیوں سے موت گتھم گتھا ہے
میں آج سے چند ماہ پیشتر دشمنوں کے
نرغے میں آ گیا تھا — انہوں نے
چھوڑ دیا — تو ہماری سرکار نے
بھی ہمیں چھوڑ دیا — چلو جنگ
سے تو نجات ملی —
تمہارا بد نصیب بیٹا
شبیر محمد

نصیبن۔ خدا خیر کرے میرے لال پہ ..... کوئی تکلیف نہ
پہنچی ہو —

فاطمہ۔ اری ..... شکر کر خدا کا ..... جنگ سے
واپس آ گیا ہے تیرا لال — ورنہ جس کا بیٹا جنگ
میں چلا جائے — پھر آنے کی بہت کم امید رہتی
ہے —

نصیبن۔ اللہ تیرا صد شکر ہے — اب میں اُسے کہیں
نہیں جانے دوں گی — میری آنکھوں کا نور آ
رہا ہے۔ میرے گھر کی رونق آ رہی ہے — بس
بہن — اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا —
رضیہ بھی سیانی ہو گئی ہے — اب مجھے
دے دے۔ میرے لال کے آنے کی خوشی میں جب
تم لوگ آؤ — تو میری رضو کو دلہن بنا کر لاؤ۔

فاطمہ۔ ای اللہ ..... بھلا میں کون ہوتی ہوں انکار

کرنے والی - یہ تو بھیا (خدا اُسے جنت نصیب کرے)
اور رضیہ کے باپ کے درمیان کا قول قرار تھا ـــــ
جو پورا ہو کر رہے گا۔

نصیبن :- پھر دیکھ کیا رہی ہے ...... اب کا ہے کا انتظار
ہے - مَیں تجھے کچھ زیور دیتی ہوں ـــــ اُنہیں
تڑوا کر نئے فیشن کے بنوا دے۔

فاطمہ :- ابھی جلدی بھی کیا ہے ! تیرا لال خود آ کر اپنی پسند
کے زیور بنوا لے گا ـــــ اچھا مَیں تو چلی ـــــ
میرے ساتھ آ کر باہر کا دروازہ بند کر لے ـــــ
شام ہوا چاہتی ہے۔

(دونوں باہر نکل جاتی ہیں ـــــ پھر
نصیبن بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل
ہوتی ہے۔)

نصیبن :- میرا لال آ رہا ہے ـــــ میرا چاند آ رہا ہے۔
مَیں نے اس کے لئے چاند سی بیوی ڈھونڈ رکھی ہے
آ لے گا تو شادی کر دوں گی ـــــ جب یہاں تھا
تو رضیہ کے نام سے شرما جایا کرتا تھا۔ کتنا خوبصورت
ہے میرا لال ـــــ رضیہ تو اس کے مقابلے میں خاک
بھی نہیں ـــــ چلو ـــــ اگر وہ رضیہ کو ہی پسند
کرتا ہے تو ٹھیک ہے ـــــ سُنا ہے ....
.... فوجی جوان بڑے دلدادہ ہوتے ہیں
یہ رضیہ کی بچی کو ابھی تک چائے بنانا بھی نہیں آتی ہو گی
ـــــ مَیں کیا کروں ـــــ میری آنکھیں پک گئی
ہیں ـــــ میرے لال .... تو کیا جانتا ہے کہ
تیری ماں نابینا ہو چکی ہے - وہ آنکھوں سے تیرے
پھول سے مکھڑے کو نہیں دیکھ سکے گی ـــــ مگر بیٹا
.... جب تو آ جائے گا ـــــ تو مجھے سب کچھ
مل جائے گا۔

(گیت گاتے ہوئے آہستہ آہستہ سو
جاتی ہے ـــــ اس غضب کی سردی
میں، بھیانک رات میں اندھیروں کے
بھوت ہواؤں کے سبک رفتار
گھوڑوں پہ سوار ہو کر آنکھ مچولی
کھیل رہے ہیں ـــــ رات جب
آدھا سفر طے کر لیتی ہے تو نصیبن
بڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔)

نصیبن :- کون ہو سکتا ہے؟ شاید کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا
ہے ـــــ شاید میرا لال آ گیا ہے؟ ......
ہاں وہی ہو گا ـــــ میرا لال ہی ہو گا ـــــ

(نصیبن باہر نکل جاتی ہے، پھر اپنے
بیٹے شیر محمد کے ساتھ کمرے میں داخل
ہوتی ہے۔)

نصیبن :- میرے لال خاموش کیوں ہے تو؟ ـــــ چارپائی
پہ بیٹھ جا میرے بچے ـــــ تو رحمت کے تانگے پر
بیٹھ کر آیا ہے؟ اس کو مَیں صبح سویرے مٹھائی
بھیجوں گی ـــــ میرے لال اب کہیں نہ جانا...
..... اب مَیں تیرا بیاہ کر دوں گی ـــــ بیٹھ جا
میرے لال ـــــ چارپائی پہ بیٹھ جا ـــــ

شیر محمد :- کہاں بیٹھوں ـــــ ما .... اماں کہاں بیٹھوں
ـــــ کدھر بیٹھوں ـــــ مَیں بڑا بد نصیب ہوں

امّاں ـــــ !

نصیبن۔ نہیں بیٹے ..... تُو غم نہ کر ـــــ میری بینائی
جانے کا تُو ملال نہ کر ـــــ میں اندھی ہوں تو کیا
ہوا ـــــ

شیر محمد۔ (روہانسی آواز میں) امّاں ! .... یہ کیا
کہہ رہی ہے تُو ؟ ـــــ تُو بھی اندھی ہوگئی ہے
کیا ؟ ـــــ آ میرے پاس میری امّاں جلدی آ !
ـــــ اُف کتنا اندھیرا ہے ـــــ

نصیبن۔ کیوں بیٹے ..... کیوں جی میلا کرتا ہے ؟
ـــــ اندھیرا کیوں ہے ؟ کیا چراغ بُجھ گیا
ہے ؟ ـــــ

شیر محمد۔ ..... (ٹھنڈی سانس لے کر) میری آنکھوں
کا چراغ تو لڑائی میں بُجھ چکا ہے ..... ممتا
کی نگاہوں کے نور کی آس تھی ..... سو وہ بھی
بُجھ گیا ہے ..... پہلے اندھیرا کم تھا .....
..... اب اندھیرا بڑھ گیا ہے ـــــ اُف
کتنی ڈراؤنی فضا ہے یہ ...... امّاں .....
..... کدھر ہے تُو ..... کہاں ہے تُو
..... آ میری ماں ...... آ مجھے سہارا
دے .....

(شیر محمد والہانہ انداز میں ماں کی
طرف بڑھتا ہے۔ میز سے ٹھوکر
لگتی ہے ـــــ چراغ اُلٹ کر
بھڑکنے کی صورت میں جل اُٹھتا ہے
..... شعلے اندھیروں سے باہم
پیکار ہیں ـــــ مگر ..... بیٹا
اس نظارے سے بے خبر ماں کی گود میں
سر رکھے سسکیاں لے رہا ہے ...
..... اور ماں شاید سوچ رہی
ہے کہ جب چاند کو بھی گہن لگ جائے
تو رات کتنی اندھیری ہو جاتی ہے۔)

ـــــ پردہ گرتا ہے ـــــ

انور شاہ ارشد (تھرڈ ایر)

مہرِ رخت سرشتِ من خاکِ درت بہشتِ من
عشقِ تو سرنوشتِ من راحتِ من رضائے تو

ساقیا در گردشِ ساغر تعلل تا بچند
دور چوں با عاشقاں افتد تسلسل بایدش

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما
ـــــ (حافظ شیرازی)

کلیم اللہ خان
(سالِ چہارم)

"دیوان ہے ہمارا کیسہ جواہری کا"

بھلا ہو بزمِ اُردو کا کہ مدت مدید بعد "مشاعرہ" کا اہتمام کرکے اُن یادوں کو تازہ کر دیا —— جب کہ سالک مرحوم نے اپنی مشہور غزل "چمن میں آنے کی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے" پہلی مرتبہ کالج کے مشاعرہ میں پڑھ کر سُنائی تھی —— اس کے بعد سے اب تک یہ بزمِ مشاعرہ کا انتظام نہ کر سکی —— نہ جانے سالک مرحوم کا سوگ مناتی رہی یا پھر نئے شعراء کی پیدائش کا انتظار —— خیر سے اس بزمِ اُردو نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا اور نامور شعراء کو مدعو کیا۔ وقت تو چھ بجے کا دیا گیا، مگر وقت سے پہلے ہی ہال میں ایک خدائی جمع ہو گئی اور ایک کہرام سا مچا رہا —— مگر محترم پرنسپل صاحب کے تشریف لاتے ہی شور و غوغا، شرافت اور سنجیدگی میں بدل گیا —— احباب کی بے چینی دیکھتے ہوئے پرنسپل صاحب نے مقامی شاعر عبدالسلام صاحب اختر سے درخواست کی کہ حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ کریں۔ اس پر آپ نے اپنی مشہور و معروف نظم 'میرا وطن' 'میرا وطن' ترنم سے سُنائی —— جو کہ زیادہ ڈھیلی کی گئی —— اس کے علاوہ ایک دو غزلیں اور سُنائیں —— اس کے بعد پرنسپل صاحب کسی اور شاعر کا انتظار کر رہے تھے —— مگر بدقسمتی کہیے یا خوش قسمتی کہ ان کی نظر ہم پر پڑ گئی اور کچھ سُنا دینے کے لئے بلایا —— بھلا ہم کونسی گنتی میں تھے جو سُناتے —— ہاتھوں میں رعشہ سا طاری ہو گیا —— بھلا ہو کاشف رفیق اور قدسی کا، فوراً بغل سے بول اُٹھے "کرشن! یاد سُناؤ، بزمِ سخن ہے کوئی کاشانہ نہیں" اس پر میاں صاحب نے پھر اشارے سے بلایا —— خیر جانا ہی پڑا۔ ڈرتے ڈرتے ایک غزل سُنائی ؎

میکدہ کا سنگھار ہیں ہم لوگ
دوستو بادہ خوار ہیں ہم لوگ
جل نہ جاؤ قریب مت آؤ
اے فرشتو گناہگار ہیں ہم لوگ

اتنے میں مہمان شعراء تشریف لے آئے، خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پروگرام شروع کر دیا گیا —— تلاوت کے بعد صدر بزمِ اُردو عبدالرشید صاحب نے شعراء کرام کا مختصر تعارف کرایا اور سب سے پہلے مقامی شاعر جناب روشن دین صاحب تنویر کو بُلا کر مشاعرہ کا آغاز کیا ——

تنویر صاحب نے "انسان اور فنونِ لطیفہ" پر اپنے خیالات کی روشنی کچھ نئے انداز میں اس طرح ڈالی ؎

پیشہ کیا فنِ شاعری کو
چھیڑا ہے ربابِ زندگی کو
لفظوں کے پھر لگے بدن پائے
ساکن کرکے مضطرب تقاضے

شمع تو تھی نہیں جو گردش کرتی ہوئی نظر امروہوی
کے روبرو نہیں ہوتی ---- اسلئے آپ خود گردش کرتے ہوئے
سٹیج پر آ پہنچے۔ دبلا پتلا جسم، درمیانہ قد، شکل و صورت سے
تو نظر کو نذر کا دھوکہ لگتا تھا ---- آپنے قلندرانہ رنگ
میں جھوم جھوم کر ایک غزل پڑھی۔ دو شعر عرض ہیں ؎

غنچہ و گل کے تبسم کا سہارا لے کر
پھر خزاں آئی ہے جیسے کہ بہار آئی ہو
کاش اس دور سے بیزار رہا ہو کے نظر
ہم جو بیٹھیں تو گلستاں میں بہار آئی ہو

"واہ واہ" اور "مکرر ارشاد" کے نعروں سے فضا
گونج اٹھی ----

اس کے بعد کلیم عثمانی صاحب تشریف لائے ----
اچھے جوڑے چکلے نوجوان ---- کشادہ پیشانی بڑی سادگی
سے غزل سنائی۔ مگر آپ کی آواز نے ایک مسحور کن سماں
باندھا ---- سب نے تخیل کی دل کھول کر داد دی ---- شعر
ملاحظہ ہوں ؎

دم صبح پھولوں کے ساغر جو چھلکے
تو تھی رہ گئی غم کے سانچوں میں ڈھل کے

ہر اک مرحلے میں جنوں کام آیا
خرد رہ گئی دو قدم ساتھ چل کے

وہیں رحمتوں کی گھٹا چھا گئی ہے
جہاں رند پہنچے جہاں جام چھلکے

جنوں نے جہاں تجھ کو آواز دی ہے
حدود تعین سے آگے نکل کے

کلیم صاحب کے جانے کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ احباب
اور ایک نئے شاعر کے منتظر تھے ---- اتنے میں طفیل
ہوشیارپوری صاحب منظر عام پر آ گئے ---- چھوٹا قد ----
بھرا بھرا جسم، مگر آواز ایسی جیسے دور کی نقرئی گھنٹیوں کی
کھنک ---- آپ نے بڑے بانکے لہجے میں شعر خوانی شروع کی ؎

میرے خیال میں تیری گلی سے جب گزرے
دل و نگاہ کو کچھ حادثے عجیب گزرے
جلائے گئے ہر ایک سانس میں وفا کے چراغ
وہ نا تمام فسانے جو زیر لب گزرے
طفیل بادۂ الفت کی مستیاں توبہ
یہ کس کو خبر کہ کب آئے اور کب گزرے

آپ کا لہجہ ایسا سب ہی کو پسند آیا ----
طفیل صاحب کے بعد چوہدری محمد علی صاحب مضطر
سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں ---- آپ نے
کچھ جھجک سی کی تو نصیر احمد خان صاحب نے آپ کی طرف کچھ اس
انداز سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں :-

"چلنا پڑے گا آپ کو بزم سخن کے بیچ"

آپ کے جنبش میں آتے ہی سب کی نگاہیں جنبش میں آ گئیں
اور فضا "تنہائی" "تنہائی" کے الفاظ سے گونج اٹھی ----
آپ کے اسٹیج پر آتے ہی خاموشی چھا گئی ---- آپ نے
بڑے سادہ مگر پر زور انداز میں اپنی نظم "تنہائی" سنائی
---- ملاحظہ ہو ؎

کتنی خاموشی ہے تنہائی ہے
اب نہ خاموش رہو
کچھ تو کہو
لب دبی کوشش گفتار ہی جنبش لب

رات لمبی ہے کوئی بات کرو
دور مت بیٹھو قریب آجاؤ

آپ کی نظم بہت ہی پسند کی گئی۔ اور خصوصاً شعراء کرام کی طرف سے "تحسین تحسین" کے الفاظ سنائی دیتے تھے ———

مضطر صاحب کے بعد شرقی بن شائق صاحب ہال کے شرقی کونے سے اٹھے اور سٹیج پر جلوہ گر ہو گئے ——— اچھے بھلے "سوٹڈ بوٹڈ" ——— شکل و صورت اور قد و قامت سے سائنس داں معلوم ہوتے تھے ——— مگر جب آپ نے دل پذیر لہجے میں اپنی غزل شروع کی تو لامحالہ اپنے حس کو غلط اور انہیں ایک بہت بڑا فنکار تسلیم کرنا پڑا سے

راہوں کی دلکشی نے سنبھلنے دیا نہیں
احساس بھی گمرہی کا نہیں بارہا ہوا
کس خامشی کے ساتھ بشر کا ہوا ظہور
کتنے سکوں سے عالم محشر بپا ہوا

فضا "مکرر" مکرر سے گونج اٹھی ——— طارق صاحب بے ساختہ پکار اٹھے "واللہ کیا شعر ہے ———

کس خامشی کے ساتھ بشر کا ہوا ظہور
کتنے سکوں سے عالم محشر بپا ہوا

اچانک بالکل خاموشی چھا گئی ——— محمد عقیل شفائی کی آواز آئی اور انہوں نے سکوت توڑا ———

ع

اے حضرت ناصح ہمیں الزام نہ دیجئے
اس عمر میں کچھ آپ بھی نادان رہے ہیں

رہزن کئی ملتے ہیں رہ دیر و حرم میں
اس خوف سے ہم بے سر و سامان رہے ہیں
اٹھتے ہوئے دیکھے نہیں کیا آپ نے لمحے
اک رات مرے آپ بھی مہمان رہے ہیں

"کیا خوب کہا ——— کیا ارشاد ہے ——— واللہ ——— شعر ہے شعر ——— اور مکرر ارشاد سے ایک ہنگامہ برپا ہوا ——— اور آپ کے دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنے سے سامعین کا جوش ٹھنڈا پڑا ———

جب عقیل صاحب چونک چکے تو ایک صاحب پکار اٹھے "بھئی وہ پٹھان شاعر کہاں ہے ———؟ سب کی آنکھیں ہر چہار سو گھوم گئیں ——— دیکھتے ہی دیکھتے ایک مسکراتا ہوا چہرہ بشاش بشاش جسم اور کرکٹ کی گراؤنڈ سے بیٹ تھام کر اٹھنے والا زندہ دل انسان منظر عام پر آ گیا ——— یہ تھے ہمارے خان نصیر احمد خان صاحب نصیر ———

آپ نے بڑی شوخی اور سرگرمی سے ایک غزل سنائی ——— ملاحظہ ہو :-

نہ یہ غم رہے گا میرا نہ میری خوشی رہے گی
جو رہے گی تو اس جہاں میں میری بے بسی رہے گی
چارہ گرو سنا ہے یہ درد کم نہ ہوگا
پیوستہ تیرِ غم کی دل میں انی رہے گی
دنیا کا آؤ ہم بھی جا کر کریں نظارا
سنتے ہیں دیر تک یہ محفل سجی رہے گی

واہ واہ سے فضا گونج اٹھی ——— مگر ثاقب زیدی صاحب کا نام گرامی سنتے ہی سکوت طاری ہو گیا ——— جب آپ اسٹیج پر تشریف لائے تو مختلف فرمائشیں کی گئیں ———

آپ نے اپنی پسند کی ایک غزل بڑے پُراثر انداز میں سُنائی۔ سے

مہکتے پھولوں کی بے ثباتی نے ایسا مایوس کر دیا ہے
کسی سے بھی ہنس کے بات کرنے کا اب ہم حوصلہ کریں گے
کچھ ایسی رسم وفا چلی ہے ہر ایک غنچہ ادا ہوا ہے
جفا بھی جو کر سکیں نہ کھل کر بھلا وہ کیسے وفا کریں گے

سب نے آپ کی داد دی اور فضا "دل مور، دل مور" سے گونج اٹھی ـــــ مگر صاحب صدر کے یہ کہنے پر کہ دوسرے دور میں فرمائش کی جا سکتی ہے، سامعین نے صبر سے کام لیا۔
اس کے بعد گھڑی دو گھڑی کا تامل کیا ـــــ کیونکہ دور کی بجائے پان کا دور چلا اور دوسری محفل گرم ہوئی۔

دوسرا دور

روشن دین تنویر صاحب سرِ فہرست ہیں ـــــ
آپ نے اپنے خاص انداز میں ایک غزل سُنائی سے

انجام دیکھ کاتب تقدیر کیا ہوا
اپنے لہو سے ہے مرا دامن بھرا ہوا
دامن میں تُو نے پھول اگر بھر دیئے
خارِ الم ہے پھر بھی دل میں چھپا ہوا

اس کے بعد مضطر صاحب کی باری آئی آپ نے نہایت سادہ مگر پُرسوز انداز میں ایک غزل سُنائی سے

یہ اک نہ اور قیامت ڈھائی لوگوں نے
پیار سے جاگ کے خوشی لٹا دی لوگوں نے
جیتے جی مرنے کے لئے سبھی جیتے رہے
مر کے بھی تسکین نہ پائی لوگوں نے

اپنے بیگانے آئے سب سُننے کو
بھیج دی مضطر کی تنہائی لوگوں نے

حاضرین جھومنے لگے ـــــ اور کلیم عثمانی ادب سے نیم قد کھڑے ہو کر آداب بجا لائے ـــــ
مضطر صاحب کے بعد نصیر احمد خان صاحب نے ایک غزل سُنائی اور لطف یہ ہے کہ آپ کے اشعار کے پھول جھڑنے کے ساتھ ساتھ آپ کا ہاتھ بھی ہلتا رہا ـــــ اور آپ کی ایک خاص مسکراہٹ کلیاں بکھیرتی رہی ـــــ
آخر میں نصیرؔ صاحب یوں مخاطب ہو کر گویا ہوئے سے

کبھی آنکھیں چُراتے ہیں کبھی آنکھیں دکھاتے ہیں
ہمارے حال پر نظر کرم یوں بھی چند لوگ ہیں

یہ آخری شعر تو طلباء کو وہیں حفظ ہو گیا ـــــ اور وقتاً فوقتاً جب بھی یہ شعر کسی کو زیرِ لب گنگناتے سُنتا ہوں تو تمام مشاعرہ کی روئیداد نظر کے سامنے سے گزر جاتی ہے۔
نصیر صاحب کے بعد نظر امروہوی صاحب نے اپنے انداز میں ایک غزل سُنائی ـــــ دو شعر سُن لیجئے!۔

گزر گیا ہم خلوص سے کر یا قبول
کون ہے جو نہیں خفا سا مجھ
کوئی آواز دے رہا ہے نظر
دل ہے بے ساختہ دھڑکتا مجھ

اس کے بعد کلیم عثمانی کے آتے ہی سکوت چھا گیا ـــــ اور آپ نے اپنی غزل سے مسحور کن تانیں بلند کیں ـــــ جو دلوں میں گھر کر گئیں ـــــ آپ کا کلام اور آپ کا انداز بیان ـــــ مشاعرے کا جو حال بھی نہ ہوتا تھوڑا تھا ـــــ سُنئے اور سر دُھنئے سے

کوئی دیکھے تو مری تشنہ لبی کا احساس
میں نے گلشن میں ہر اک پھول کو پیمانہ کہا

عمر بھر جلتے رہے شمع کی صورت خاموش
دیکھنے والوں نے پھر بھی ہمیں پروانہ کہا

ہائے کیا چیز ہے احساسِ غمِ زیست کلیم
آج تک ہم نے تمنا کو تمنا نہ کہا

سب نے دل کھول کر داد دی اور ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھنے پر مجبور کیا ——— اور ہال "ون مور" "ون مور" "ون مور پلیز" کے الفاظ سے گونج اٹھا ——— اور کسی سے بھی نچلا نہ بیٹھا گیا جب تک کلیم صاحب ایک اور غزل سنانے پر رضامند نہ ہو گئے ——— چند شعر عرض ہیں ؎

جب تک تیرے خیال سے وابستگی نہ تھی
کہنے کو زندگی تھی مگر زندگی نہ تھی

کیا جانے کیوں ہر ایک سے پتہ پوچھنا پڑا
حالانکہ تیری راہ گزر اجنبی نہ تھی

ہم کو بھلا کے آج وہ یوں مطمئن سے ہیں
جیسے ہماری ان سے کبھی دوستی نہ تھی

طفیل ہوشیارپوری صاحب نے باری آنے پر اپنے مخصوص انداز میں ایک غزل پیش کی جس کے تین شعر سن لیجئے ؎

گزری ہے گراں روح پہ کلیوں کی چٹک بھی
ہم لوگ بہاروں میں بھی مغموم رہے ہیں

اے شمع پتنگوں کا ذرا حسنِ نظر دیکھ
نذرانۂ جاں دے کے بھی محروم رہے ہیں

آجاؤ کہ افسانۂ ہستی ہو مکمل
غم اور خوشی لازم و ملزوم رہے ہیں

سبحان اللہ کیا زورِ بیان ہے ——— اور کیا شوکتِ الفاظ ہے! کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ———

کوہستانی پر طلباء کا بے تحاشا داد دے کر شور و غوغا کرنا بہت گراں گزرا ——— ادھر یاروں نے کبھی پنسل مانگ کے کبھی کاغذ مانگ کر بہت تنگ کیا ——— قافیہ تنگ ہونے پر کوہستانی نے سب کو ٹکا سا جواب دے کر ایک طرف دامن تہمد تلے دینے سے بچا لیا تو دوسری طرف نادر موقعہ کو ہاتھ سے کھونے سے بچا لیا ———

اس کے بعد شرقی بن شائق صاحب کی باری آئی آپ نے بڑی سرگرمی کے ساتھ ایک غزل سنائی ؎

ہر ایک دل میں ہوس کے چراغ جلتے ہیں
کہاں سے کوئی محبت کی روشنی لائے

سمجھ لیا ہے انہیں صاحبِ نظر ہم نے
نگاہ جن کی اجالوں میں ٹھوکریں کھائے

وہی سمجھتے ہیں کانٹوں کی اہمیت شرقی
جو آشنائے کمالِ بہار ہوتے ہیں

قتیل صاحب کا نام سنتے ہی سب گوش برآواز ہو گئے اور خاموشی محیط ہو گئی ——— مگر آپ کے قلندرانہ انداز اور میٹھی آواز نے خوب سماں باندھا ؎

شدتِ دردِ محبت کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

دیکھتا ہوں ترا اندازِ تغافل لیکن
سوچتا ہوں تری عادت کبھی ایسی تو نہ تھی

جانے کیا بات ہے اربابِ جنوں یاد رہے
جیب و دامن سے عداوت کبھی ایسی تو نہ تھی

آپ واپس آنے لگے تو شور اُٹھا کہ ایک اور سنائیں
—— آپ نے معذرت چاہی مگر احباب کے اصرار پر ایک اور
غزل سنائی ؎

کیا جانے کیوں محرومی ہی لکھی تھی ازل سے قسمت میں
اک موج میں ساحل پاس آیا اک موج میں ساحل دور ہوا
اک جلوہ گہِ ہستی میں نظر یہ اپنی اپنی قسمت ہے
پروانے جلے تو خاک ہوئے اور شمع جلی تو نور ہوا

آخری شعر سن کر میرے ایک ساتھی سعید بٹ صاحب
بے اختیار چیخ اُٹھے —— "واللہ دل کی عظمت کن الفاظ میں
بیان کی ہے"

طفیل ہوشیارپوری صاحب سے فرمائش کی گئی کہ کچھ
اور سنائیے پہلے تو آپ نے معذرت چاہی مگر بار بار کہنے
پر ایک ہندی نظم سنائی —— جو جادو بیانی سے کم نہ تھی ؎

تاروں کی چلمن سے جھانکے پھولوں میں مسکائے
روپ نگر کی اس رانی کا گھونگھٹ کون اٹھائے
گوری نے مکھڑے پر کالی لٹ کچھ ایسے چھپ کے کھلائے
چاندنی جیسے جھوم جھوم کر ناگ کوئی بل کھائے
ہم ہیں دھرتی کے اندھیارے وہ آکاش کی جوت
اندھیارا جوتی سے آخر کیسے نین ملائے

اس کے بعد قتیل شفائی صاحب تشریف لائے اور ایک
غزل سنائی ؎

ڈھل گیا چاند گئی رات چلو سو جائیں
ہو چکی اُن سے ملاقات چلو سو جائیں
لوگ اقرارِ وفا کر کے بھلا دیتے ہیں
یہ نہیں کوئی نئی بات چلو سو جائیں

آپ کی اس غزل نے سامعین کے جذبوں کو مزید
بڑھا دیا اور آپ سے ایک اور غزل کا مطالبہ کیا گیا ——
جس پر سب تڑپ اُٹھے اور دل کھول کر داد دی ؎

بہتر ہے یہی ساقی تیری زلف کا سایہ
کہنے کو یہ دنیا بھی غریب الوطنی ہے
پھولوں سے لپٹتی ہے مگر کتنی حیا سے
یہ چاندنی شاید ترے آنچل سے چھنی ہے
مل مل کے گلے تم تو یہ میکدہ والو
اِک شیخ و برہمن میں تو مدت سے ٹھنی ہے

اب ثاقب زیروی صاحب کی باری تھی اور اس پر خاتمہ
سخن تھی —— جب صدرِ محترم نے آپ کا نام پکارا تو مجمع
میں ذوق و شوق کی ایک لہر دوڑ گئی —— اور کئی فرمائشیں
کی گئیں —— جن میں سے آپ نے "یاد دہانی" کو ترجیح دی
—— اور اپنی پُرسوز آواز سے ایک ہیجان برپا کر دیا ؎

لو مئے بجام آ گئی
وہ لالہ فام آ گئی
جنوں بہ بام آ گئی
ہوائے عام آ گئی

ابھی تو عام ہے پیو
خرد غلام ہے پیو
وہ عصمتیں جو لٹ گئیں
وہ بیٹیاں جو چھن گئیں
تمہیں جو یاد تک نہیں
یہ ان کا خون ہے پیو
پیو، پلاؤ اور پیو

اُن کے یہ اشعار سُن کر ایک جلے دل نے چلّا کر کہا۔
"ظالم یہ کہاں کا ذکر چھیڑ دیا ـــــ تڑپا دیا ـــــ بہلا دیا
ـــــ دل کو ہائے "
یوں شعروں کی بندش، روانی اور واقعہ نگاری
کو سب نے سراہا ـــــ مگر وا اسفٰی افسوس! کہ ان واہ وا
کرنے والوں کو اِس نظم کا پس منظر معلوم ہوتا ـــــ یہ وہ
وقت تھا جبکہ آنکھوں کو خون کے آنسو رونا چاہیے تھا ـــــ

اس کے بعد صدر صاحب نے معزز مہمانان اور دیگر
سامعین کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا ـــــ اور مشاعرہ کے
اختتام کا اعلان کیا ـــــ تمام خلقت باہر نکل آئی ـــــ
اندھیرا گھُپ ـــــ سب نے اپنی اپنی راہیں پکڑیں ـــــ
دُھند، دھوئیں اور دھندلکے سے ہلکی ہلکی آواز
"یہ اِن کا خون ہے، بچاؤ، بچاؤ اور بچاؤ"
کوہستان کے پردۂ سماعت سے آ کر ٹکراتی رہی ـــــ

طارق سعید طاہر
(سالِ چہارم)

یا مر کے چین پائے دلِ مضطرب ہمارا
یا اُن کو بھول جائے دلِ مضطرب ہمارا

ہمیں اپنے ڈوبنے کا غم کس لئے ستائے
جب بڑھ کے آ بچائے منجدھار میں کنارا

تیری آس کے سہارے وہ دن تو کٹ گئے تھے
آ آ کے پھر منائے تیری آس کا سہارا

جاگے رہیں گے ہم تو سوئے نصیب لیکر
ٹوٹے ہوئے کھلونے اُمید و آرزو کے

کہاں لے کے ان کو جائے طاہر غموں کا مارا

انور شاہ ارشد
(بھرڈانیہ)

پارہ ہائے دانش

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد
ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد ـــــ (سعدی شیرازی)

از نوشت منیر احمد خان
سالِ اوّل (بی۔ اے)

پہاڑوں کے اُس پار

ڈاکرہ کی بستی کوہ ہمالیہ کے طویل پہاڑی سلسلوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں کے باشندے بہت جفاکش اور سادہ لوگ تھے۔ یہ بستی باقی دنیا سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ یہاں تک پہنچنے اور نکلنے کے لئے دشوار گذار پہاڑوں کو عبور کرنا اور خوفناک طوفانوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سارا سال برف کے طوفان اس بستی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ـــــ اور ـــــ سال میں چند ہی دن ایسے آتے جب سہانا سورج اپنی کرنوں سے یہاں کے لوگوں میں بیداری پیدا کر دیتا۔

ایک قافلے کے کچھ بچے کھچے لوگ دشوار گذار پہاڑوں اور بھیانک گھاٹیوں کو عبور کرتے ہوئے اس بستی تک پہنچے۔ انہیں لوگوں میں ڈاکرہ کا ایک سوداگر گل محمد بھی تھا۔ وہ آج سے بیس برس قبل تجارت کی غرض سے پردیس چلا گیا تھا۔ اُس کی بامراد واپسی پر کئی دنوں تک اس کے گھر میں شہنائیاں بجتی رہیں۔ لوگ آ کر اُسے مبارکباد دیتے اور پھر پنڈال میں بیٹھ کر اُس سے پردیس کے حالات نہایت دلچسپی کے ساتھ سنتے۔ ایک دن وہ گاؤں کے نوجوانوں کو حالات سناتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "اے میرے ہم وطنو! اے میرے نوجوان بھائیو! اگر تم تہذیب سے روشناس ہونا چاہتے ہو، اگر تم اپنی قوم کو دنیا کے شانہ بشانہ چلانا چاہتے ہو تو یاد رکھو! کہ آجکل دنیا میں علم کی بہت قدر ہے۔ پس علم حاصل کرو۔ اور پھر اپنی قوم کی خدمت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ ان خوفناک پہاڑوں کو عبور کر کے دور پردیس میں جا کر تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل امر ہے لیکن کیا تم میں کوئی نوجوان ہے جو محض اپنی قوم کی ترقی کی خاطر ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے علم حاصل کرے۔"

وہ تقریر کر رہا تھا۔ اس کے ہر ہر لفظ میں جادو بھرا ہوا تھا۔ اس کی آواز سحر تھی۔ نورے کے دل میں ایک انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کاش وہ اپنی قوم کا ایک درخشندہ ستارہ ثابت ہو سکے۔ کاش کہ وہ علم حاصل کر کے اپنی قوم کو تہذیب نو سے ہمکنار کر سکے۔ مقرر کہہ رہا تھا "قوم ہمیشہ قربانیوں کی بدولت ترقی کرتی ہے۔ کوئی ہے جو اپنی روح، جسم اور زندگی کی قربانی کر سکے۔" نورا کھڑا ہو گیا۔ اس کی بھاری آواز پنڈال میں گونجی "میں قوم کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔" تاجر نے اُسے کہا "تجھے حصول علم کے لئے ان ہیبتناک پہاڑوں سے اُس پار جانا ہو گا اور پھر واپس آ کر قوم کی خدمت کرنی ہو گی۔"

"میں تیار ہوں" وہ بولا۔ مجلس پر سناٹا طاری تھا۔ لوگ اس کی جرأت پر انگشت بدنداں تھے۔ اس کی بوڑھی اور ضعیف ماں کانپتی ہوئی آواز میں بولی "بیٹے! میرے بڑھاپے کا تو ہی ایک سہارا ہے۔ میری زندگی دکھ کے کانٹوں سے تار تار

ہے۔ میری امیدوں کے سہارے! میرے لختِ جگر! اگر تو بھی مجھ سے بچھڑ گیا تو میری دنیا تاریک ہو جائے گی۔ کیا تو بھول گیا ہے کہ انہیں ظالم اور خوفناک گھاٹیوں نے تیرے باپ کو ہڑپ کیا تھا، مجھے خطرہ ہے کہ یہ دشوار گذار پہاڑ، ظالم طوفان اور ہیبتناک گھاٹیاں تیرے باپ کی طرح تجھ کو بھی مجھ سے نہ چھین لیں۔"

"ماں! تسلی رکھو! میں علم حاصل کر کے پھر اسی وطن میں واپس آؤں گا اور اپنی قوم کی خدمت کروں گا۔"

اس کی ماں اس جواب کے طبعی صدمے کے اثرات کو برداشت نہ کر سکی ـــــ اور ـــــ وہ بیہوش ہو گئی۔

دوسرے دن نورا قافلے کے ہمراہ پردیس جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ماں نے روتے ہوئے اُسے الوداع کیا۔ قافلہ روانہ ہو گیا۔ نورے کا ہر قدم قومی خدمت کے جذبے سے سرشار اُٹھ رہا تھا، وہ اپنے اندر ایک قوم کی طاقت کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ ایک فرد نہیں رہا بلکہ قوم کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ اپنی قوم کا نمائندہ ہے۔ وہ سوچتا رہا کہ اب اس کی غلطی دراصل ایک قوم کی غلطی ہوگی۔ قدرت انفرادی گناہوں کو معاف کر دیا کرتی ہے لیکن قومی گناہگاروں کو ضرور سزا دیتی ہے۔

تنگ وادیوں، تاریک گھاٹیوں، سربفلک چوٹیوں، اور برف کے تودوں کو عبور کرتا ہوا یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ چند دنوں کی مسلسل جدوجہد کی بدولت وہ شہر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُس دن جب نورا صبح نزدیک پہاڑ کی چوٹی پر سے شہر کی سربفلک عمارتوں اور موٹر کاروں کی قطاروں اور بازاروں انسانوں کے بے پناہ ہجوم کا نظارہ کر رہا تھا تو اُس کا دل مسرت کے نغمے الاپنے لگا۔ اس کی زندگی کے چمن میں منہ بند کلیاں چٹک کر کھل اٹھیں۔ وہ زندگی کا ایک نیا باب دیکھ رہا تھا جہاں دولت کے محلات میں بیٹھ کر رباب کی تانوں سے دل بہلانے والے بھی تھے اور دوسری طرف وہ لوگ بھی موجود تھے جن کے خون اور پسینے سے اُن محلات کی بنیادیں تعمیر ہوئیں۔

نورا ایک اسکول میں داخل ہو گیا ـــ اُس نے بڑی محنت سے تعلیم حاصل کی۔ دو سال کے قلیل عرصہ میں قومی خدمت کے جوش کے تحت اُس نے اتنا علم حاصل کر لیا جو اس کے ساتھی چھ سالوں میں بھی حاصل نہ کر سکے۔ اب وہ اپنے گاؤں واپس جانے کے لئے تیار تھا۔ اُس نے گاؤں کے لوگوں کو جدید دنیا کی ایک جھلک دکھانے کے لئے بندوق خریدی، گاؤں کے بچوں کے لئے عجیب و غریب کھلونے خریدے۔ پھر وہ بندوق کو کندھے پر لٹکائے اپنے وطن کو روانہ ہو گیا تاکہ جلد سے جلد وہ اپنی قوم کو جہالت کے سلاسل سے آزاد کرائے۔

برف کے طوفانوں اور خوفناک گھاٹیوں کا سامنا کرتے ہوئے اس کے قدم بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جوں جوں وہ سربلند پہاڑوں اور برف پوش چوٹیوں کو سر کرتا ہوا شاکرہ کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہو رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جاتے ہی اپنی ماں سے کہے گا "ماں! میں آگیا ہوں، اب میں اپنی قوم کی خدمت کروں گا۔ میں ان کا سردار بن کر ان کی حالت کو بدل دوں گا۔ ان کو خوراک زیادہ دیر تک محفوظ رکھنے کے نئے نئے طریقے بتاؤں گا۔ اس طرح سے ہماری قلتِ خوراک کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

یہ آخری کھائی تھی جس کو عبور کر کے اُس نے اپنے وطن کی سرزمین میں قدم رکھنا تھا۔ وہ دس میل کا کٹھن سفر چھ انچ کے ایک تنگ سے راستے پر طے کرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس چھ انچ کی پگڈنڈی کے ایک طرف آسمان کی بلندیوں سے باتیں کرتی ہوئی چوٹیاں تھیں اور دوسری طرف تین میل گہری کھائی تھی جس میں دریا بہہ رہا تھا۔ دائرہ کی بستی کو بیرونی دنیا سے ملانے والا چھوٹا سا پُل دس بارہ قدم کے فاصلے پر تھا۔ کھائی سے پرے دوسری طرف اس کا ایک دوست بھیڑوں کو ہانک رہا تھا۔ اس نے نورے کو دیکھ کر فرطِ مسرت میں نعرہ لگایا اور اسے خوش آمدید کہا۔ نورے نے اُسے حیران و پریشان کرنے کے لئے سامنے پہاڑی پر بھاگتی ہوئی بلی پر بندوق سے فائر کر دیا۔ وہ زخمی ہو کر لڑھکنے لگی۔ نورے نے اس کو پکڑنا چاہا اور بالآخر اسی کوشش میں وہ تین میل گہری اور تاریک کھائی میں گر پڑا۔ اور اس کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ اس کا دوست اس ہولناک سانحہ کی تاب نہ لا کر چیخ مار کر بھاگا اور گاؤں پہنچ کر اس نے دروازے پر منتظر بوڑھی ماں کو اس کے لختِ جگر کی وفات کی المناک خبر سنائی۔ وہ کچھ دیر تک بے ہوش رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پھر وہ اچانک بولی "تم جھوٹ بولتے ہو میرا بیٹا تو زندہ ہے۔ وہ آ رہا ہوگا۔ میں اس کا انتظار کروں گی۔"

پھر وہ ہر روز سورج نکلنے سے پیشتر ہی دریچے میں کھڑے ہو کر بیٹے کی راہ تکتی رہتی۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی رہی۔ موسم سرما اپنے جوبن پر آ چکا تھا۔ شب بھر تند ہواؤں اور برف کے طوفان اُس کی بوسیدہ جھونپڑی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ سورج کا حسین چہرہ برف کے تودوں اور دھند کی چادر میں سے شرماتا لجاتا نمودار ہوتا رہا۔

وہ اپنے بیٹے کا انتظار کرتی رہی۔ اس کی نگاہیں کھائی کے پل سے اُس پار دھند میں لپٹی ہوئی اشیاء کی جستجو کرتی رہیں۔ آخرکار ایک دن جب صبح سویرے اس نے دریچہ کھولا تو اس نے کھائی کے اس پار دھند میں اپنے پیارے بیٹے کی شکل دیکھی۔ گلابی ہونٹ، پیاری آنکھیں اور پہاڑ کا جوان حُسن اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ پھر اُسے معلوم ہوا جیسے وہ شکل اُسے کہہ رہی ہو "ماں! دیکھ میں آ گیا ہوں۔ اب میں اپنی قوم کی خدمت کروں گا۔ ماں! اب تو غریب و نادار نورے کی نہیں بلکہ اس قوم کے سردار نور علی خان کی ماں ہو گی"۔ ضعیف ماں کے خشکی سے منجمد لب کانپے "میرے جگر کے ٹکڑے! میں تیرے استقبال کے لئے آ رہی ہوں"۔ اس نے دروازہ کھولا اور دیوانہ وار کھائی کی طرف بھاگی۔ پُل کافی دُور تھا اُس نے دیکھا کہ اس کے بیٹے کی شکل کے سامنے دھند کا ایک سفید سا پُل بن گیا ہے۔ وہ تیزی سے اُس پل کی طرف بھاگی تاکہ جلد از جلد اپنے پیارے لال کو گلے سے لگا لے۔ اور دوسرے ہی لمحے کھائی میں گرنے اور چیخوں کی دلدوز آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔

دھند چھٹ چکی تھی ـــــ اور ـــــ سورج نے ایک اور المناک منظر دیکھا کہ بوڑھی ماں کی روح اپنے اُس بیٹے کو ملنے کے لئے آسمان کی بلندیوں کی جانب پرواز کر چکی تھی جس کی موت قوم کے نام ایک نذرانہ تھی۔

مبشر احمد سدھو
(سال چہارم)

ہمارے کالج میں کشتی رانی

متجسس نگاہوں سے المنار کے پرچہ آنے کو دیکھا لیکن اس موضوع پر کسی کا قلم اٹھتا نظر نہ آیا۔ اٹھ بھی کیسے سکتا تھا۔ ایسے موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے اچھے بھلے مضبوط اور طاقتور بازوؤں کی ضرورت تھی "ہر چہرہ روشن یہ جان در دشتی" آخر اس کٹھن عنوان کا مقابلہ کرنے کے لئے بدولت ہی کو میدانِ قلم میں کودنا پڑا۔ اہلِ قلم حضرات مجھ جیسے غیر معروف وجود کو اس میدان میں دیکھ کر شاید تیوری چڑھائیں۔ لیکن امید ہے کہ جگہ دیں گے اور ایک نئے پہلوان کو میدانِ قلم میں پا کر فخر محسوس کریں گے۔ اچھا! خیر رکھئے گفتگو اور سماعت آپس میں لگئے۔

آؤ ذرا تعارف کرا دوں آپ کا اس کھیل اور کھیلنے والوں سے۔ یہاں کون ناواقف ہے بھلا اس کھیل سے؟ وہی تو ہے ایک کشتی اور پانچ بیچارے کشتی ران۔ چار مضبوط ترین طلباء بلکہ [illegible] bona fide طرح۔ ایک ایک چپو اپنے ہاتھوں میں لئے یوں اندھا دھند چلاتے ہیں کہ ان پر دیوانوں کا گمان ہوتا ہے اور پانچواں دُبلا پتلا ساتھی ایک بیٹھا سا چپو ہاتھ میں دبائے کشتی کے پچھلے حصہ پر بڑی شان اور پورے اطمینان سے بیٹھا "اُبھ" آپ کی رٹ لگا رہا ہے۔ ذرا کسی نے چپو ڈھیلا کیا تو جناب پھر اپنا کی خیر نہیں۔ یہ صاحب ٹوٹ پڑے اس پاداش سے جانے کو پھر پہلی سی رفتار پر لا کر چھوڑا۔ کشتی میں یہ حضرت ہی تیس مار خان ہوتے ہیں۔ کبھی تو صاحب اکڑ کر بیٹھے ہوتے دوسروں کو ڈانٹتے ہیں۔ چپو چلانے والوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کی ڈانٹ ڈپٹ ان کو محسوس تک نہیں ہوتی۔ اگر محسوس کریں تو صرف ایک ہی پاؤں سے اشارے سے بچا لیتے ہیں اور خالی کو چاروں شانے چت دریا میں پھینک دیں لیکن یہی کشتی میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں وہ ان کا اس طرح حکم مانتے ہیں جیسے فیل بان کا ہاتھی۔ باہر قدم رکھتے ہی یہ خوشامد کر کے انہیں پھر راضی کر لیتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کسی کا غصہ پھر بھی باقی رہا تو ایک آدھ دھکا بھی سہنا پڑا۔

شام و سحر مشق کرتے ہیں۔ سردیوں میں تو سوائے مشق کے اور کچھ کرنا ہی نہیں ہوتا۔ ہاں دودھ پینا لازمی ہے لیکن یاد ہے کہ کبھی کبھار کسی لغزش کے نتیجہ میں یہ دودھ بند بھی کر دیا جاتا ہے۔ اس پہ ہم ستم رسیدہ دور سے ٹک ٹک کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر آگے گزر جانے پہ مجبور ہو جاتے ہیں ؏

ہمارے حال پہ نظرِ کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

بوقتِ صبح منہ اندھیرے ہی دریا پہ پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن سب جاتے Coach کو ساتھ نہیں لے جاتے۔ تاکہ وہ مرغوں کے ساتھ مل کر اپنی ڈیوٹی کو احسن طریق سے سرانجام دے سکے۔ اگر کسی دن یہ بیچارہ چلا بھی گیا تو تمام دن ٹھٹھرتے ہی گزرا۔ اگر اتفاقاً نہ آئے تو کسی دن کوئی صاحب جا کر تجربہ کر کے دیکھے تو ہرنے سے تمام دن طلاق ہی گزرتا ہے۔

معاذ اللہ ہرگز نہیں۔ ذرا ہمارے ساتھ کسی دن صبح کو شمولیت تو فرمائیں۔ چھٹی کا دودھ یاد نہ آ جائے تو کہنا۔ اور اگر دوبارہ جانے کا نام لو تو ہم مجرم۔ یقین جانئے کہ نمونیہ ہو جائے یا کم از کم تمام سرما زکام میں مبتلا رہو۔

قصہ مختصر وہاں ہم چار دن سر پھرے علاوہ ازیں ملاح، کشتی اور دھند کے سوا ساحلِ دریا پر کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن اندرونِ دریا آبِ سرد کی تند و تیز موجیں بادِ سحر کے جھونکوں سے گرم ستیز نظر آتی ہیں۔ اور ہمیں اپنے اندر داخل ہونے سے روکتی اور ڈراتی ہیں لیکن ٹی آئی کالج کے پہلوان تو تمام دنیا کا مقابلہ کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ان بے چاری لہروں سے کب ڈرتے ہیں۔ اسی غصہ میں آ کر اپنے گرم گرم کپڑوں کو اتار کر کنارے پر رکھتے ہیں جو ہماری غیر موجودگی میں کنارے کو رونق بخشتے ہیں اور ہم اپنا اپنا ہتھیار سنبھالتے ہوئے کشتی کی برفانی نشستوں کو صاف کرتے ہوئے بہادرانہ انداز میں کشتی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر دریا کی لہریں اور سرد ہوائیں جو دھند اور کہر کے بھیس میں ہوتی ہیں ہمارے راستہ سے ہٹ کر ہمیں آگے گزر جانے کو کہتی ہیں اور ہم آن کی آن میں دھند اور کہر کے بادلوں میں دور اور بہت دور نکل جاتے ہیں۔ اتنی دور کہ جہاں کنارے پر کھڑے ہونے کی حالت میں پہنچنے کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ یہی دکھائی دیتا ہے کہ دھند اور کہر کے یہ بادل ابھی سب کو مع کشتی واپس دھکیل دیں گے۔ لیکن ہم ان سب پر غالب آتے ہیں۔ اور جب انہیں باز آتا دیکھ کر فتح و نصرت کا ہار اپنے گلے میں ڈال کر واپس آنے کے خیال سے مڑتے ہیں تو ہم پر دوبارہ یہ بادل اس طرح چڑھائی کرتے ہیں کہ سوائے کشتی کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ ان کا یہ ہجوم دیکھ کر پھر غصہ میں جلد ہی چپو لگاتے ہیں اور یہ بادل میدانِ کارزار سے ڈر کر بھاگے ہوئے باغیوں کے ریلے کی طرح ہمارے راستہ سے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں اور ہم چپو پر چپو لگاتے چند ہی منٹوں میں واپس آتے ہیں کنارے پر متکبرانہ انداز میں چہل قدمی کرتے ہیں اور یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے اس معرکہ میں کامیاب ہونے پر داد کے خواہاں ہیں۔ لیکن کنارے پر کوئی داد دینے والا نہ پا کر اپنا سا منہ لے کے پھر کشتی پر سوار ہوتے ہیں اور تاراج شدہ علاقے پر پوری طرح قابض ہونے کے لئے دوبارہ چڑھائی کرتے ہیں۔ ان میں سے باقی ماندہ بادل ہمیں اپنی جانب دوبارہ آتے دیکھ کر دم دبا کر یوں بھاگتے ہیں کہ باوجود ہمارے پورے تعاقب کے ہاتھ نہیں آتے اور ہم پہلے سے بھی آگے نکل جاتے ہیں لیکن وہ آنکھوں سے اس طرح اوجھل ہوتے ہیں کہ تمام دن دکھائی دینے کی جرأت نہیں کرتے۔ خود بخود سے واپس لوٹتے ہیں۔ اور جا بجا کہر کی عرقِ انفعال کے قطرے زمین پر گرتے محسوس کرتے ہیں۔ ہم فوراً اپنے گرم گرم کپڑوں میں لپٹ جاتے ہیں۔ اس اثنا میں مشرقی افق سے ہلکی ہلکی شفق زیادہ نمایاں ہونا شروع ہوتی ہے اور آخر آفتاب اپنے شبنم سے دھلے ہوئے حسین چہرے کو ہماری حوصلہ افزائی کے لئے بے نقاب کر کے ہمیں ہماری کامیابی پر نہایت احسن طریق سے سلام کہتے ہوئے مبارکباد کا تحفہ دیتا ہے۔ اور پھر الوداع کہتا ہے۔ ہم فرحت، شادمانی اور مسرت آمیز چہروں سے واپس لوٹتے ہیں۔ ہماری عدم موجودگی میں ہمارا معاون و مددگار یعنی اکثر تمام دن ہمارے مفتوحہ علاقہ کی

نگرانی کرتا ہے۔ شام سے ذرا پہلے ہم پھر دریا پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہمارا ہمدم ہمیں خوش آمدید کہتا ہے اور دُھند اور کُہر سے بالکل صاف دریا ہمارے سپرد کرتے ہوئے اپنا چہرہ آہستہ آہستہ مغربی اُفق میں چُھپا لیتا ہے۔ ہم بھی واپس آجاتے ہیں اور صبح و شام کی محنت شاقہ سے نڈھال ہونے کی وجہ سے نرم نرم بستر ملتے ہی کچھ اس طرح گرتے ہیں کہ بغیر کروٹ بدلے رات گزر جاتی ہے۔ آخر اس خوابِ نیم مرگ سے با دلِ نخواستہ علی الصبح طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے بیدار ہونا پڑتا ہے اس ڈر سے کہ دُھند اور کُہر کے بادلوں کو طلوعِ آفتاب سے قبل ہی دریا سے خارج کر دیں تاکہ دریا کو خالی نہ پاکر ہمارا دوست ہمیں ملامت نہ کرے۔ یہ عمل کم از کم ڈیڑھ ماہ تک جاری رہتا ہے۔ آخر کار موسمِ سرما بھی ہم سے تنگ آجاتا ہے اور جاڑا دُم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ اِدھر ہمارے اہم مقابلہ جات قریب آتے ہیں۔ اِس پر ہم بھی دریائے چناب کے وسیع پھیلاؤ کو سلام کہتے ہوئے دریائے راوی کے کنارے جا پہنچتے ہیں۔

دورانِ مشق اِس قدر سخت سردی کا مقابلہ کرنا صرف ہم جیسے دلیروں ہی کا کام ہے۔ تمام لوگ یہ کام کرنے سے عاجز ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ ہمارے کرم فرما کالج کا خاص تعلق ہے جو ہمیں سردی کا مقابلہ کرنے کے تمام سامان اور اسباب مہیا کرتا ہے تبھی تو ہر روز سردی کو اپنے سر سے نکالتے ہوئے دلیرانہ مشق جاری رکھتے ہیں۔

اوہو! ہم تو دریائے راوی پر تھے۔ ہاں! تو پھر صاحب دو تین دن میں دریائے راوی کے پانی اور وہاں کے ماحول سے پوری طرح متعارف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہماری نئی رفیقۂ رزم (کشتی) بھی ہمیں پہچان لیتی ہے۔ اور ہم اس میں بیٹھ کر انتہائی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ایک تو کشتی نئی اور دوسرا یہاں کا پانی بھی ہلکا یعنی سونے پر سہاگہ کا کام بن جاتا ہے۔ یہاں (دریائے چناب پر) ہماری کشتیاں تو شاید بابا آدم کے زمانہ کی ہیں جن پر کیل وغیرہ بار بار لگانے سے کافی بوجھل بن گئی ہیں اور چناب کے پانی کا بھاری ہونا تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ وہاں تو جناب عجیب سماں ہوتا ہے۔ تمام مخالف ٹیمیں جو یقیناً دانستہ ہمارے ارد گرد چکر لگاتی ہیں اور کنارے پر بیٹھے ہوئے ناخدا بھی متعصبانہ نگاہوں سے ہمیں دیکھتے رہتے ہیں اور ہم ہیں کہ اپنے خدا پر بھروسہ کیے ہوئے اُن کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھتے ہوئے بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

آخر مقابلے شروع ہوتے ہیں اور ہم متواتر پانچ دن تمام ٹیموں سے آگے رہتے ہیں اور خدا کے فضل سے ان میں سے کوئی بھی ہمیں نہیں پہنچتی۔ پانچویں دن فائنل میں ہمارے چیمپئن ہونے کا اعلان ہو جاتا ہے اور ہم خوش و خرم کامیابی کا سہرا لئے واپس لوٹتے ہیں اور ہمارے اعزاز میں کالج میں ایک دو چھٹیاں ہو جاتی ہیں۔ یاد رہے ان چھٹیوں کے لئے ہمیں دوسری ٹیموں کی طرح حضرت میاں صاحب کے دروازے کو بلاک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ چھٹیاں مل جانے پر ہمارے ہم جلیس حضرات کے دلوں سے یہی دُعا نکلتی ہے کہ "اللہ کرے زورِ چپو اور زیادہ"۔ یہ سلسلہ سالہا سال سے جاری ہے۔ دُعا ہے کہ خدا تعالیٰ اس سلسلہ کو ہمیشہ جاری رکھے۔

مقابلہ جات ختم کرنے پر ہم چپوؤں کو اپنے کندھوں سے اُتار پھینکتے ہیں لیکن فکرِ امتحان غیر شعوری طور پر سر پر سوار ہو جاتا ہے پھر ہم اور امتحان! اور جو کچھ ہوتا ہے اس سے کون ناواقف ہے

احادیث نبویہ

مولانا ابو [illegible] صاحب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سفر کی دُعا

مذہب اس راستہ کو کہتے ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے ملا دے۔ مذہب میں عبادات اور دوسرے احکام کی یہی غرض ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کر سکے اور اسے اللہ تعالیٰ کا قرب مل جائے۔

شریعت کے احکام کے لئے ایک نمونہ اور اسوہ کی ضرورت ہے جس کی زندگی خدا نما ہو اور جس کے نقش قدم پر چلنے سے انسان **خدا رسیدہ** بن سکے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوہ **حسنہ** قرار دیا ہے اور آپ کی اتباع کو محبت الٰہی کے حصول کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اسلئے ہر مومن کا فرض ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی پیروی کرے۔ آپ کے اعمال کی طرح اعمال کرے اور آپ کے اقوال کی مانند اقوال کہے۔ آپ کے قول اور فعل کے مطابق پیدا کرنا ہی آپ کی **اتباع** ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات کا جاننا کس قدر ضروری ہے اور حضور علیہ السلام کے اقوال یعنی احادیث کا علم کتنا لازمی ہے۔

احادیث نبویہ میں قرآن مجید کے احکام کی عملی تفسیر ہے۔ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کے نقوش اجاگر ہیں۔ احادیث کو پڑھنے سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ آپ کی پاکیزگی اور بلند روحانی اخلاق نمایاں ہو جاتے ہیں اور انسان کے دل میں ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرے ان سے محبت کرے اور ان کی زندگی کو اپنی طاقت کے مطابق اپنا لے۔ یہ ولولہ جب عملی شکل اختیار کرتا ہے تو انسان اپنے اندر ایک روحانی زندگی محسوس کرتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔

احادیث نبویہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر چھوٹے بڑے کام کے لئے پوری کوشش اور سارے ذرائع اختیار کرنے کے باوجود پوری توجہ اللہ تعالیٰ سے **دُعا** کی طرف رکھتے تھے اور آپ کو کامل یقین تھا کہ ہر کام صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے سرانجام ہوتا ہے۔ اور اسی کی نصرت سے انسان کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

کتب احادیث میں ایک باب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا آتا ہے جس کے پڑھنے سے ایک عجیب مزہ آتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے انتہائی عشق ہے اور آپ ہر مرحلہ زندگی میں اسی کی مدد و نصرت کے طلبگار ہیں۔ ان بزرگانہ دعاؤں میں سے آج اس مقالہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سفر کی دعا درج کرتا ہوں۔ سفر ہر انسان کو پیش آتا ہے اسلئے یہ دعا یاد کر کے اپنے سفر میں کرتے رہنا چاہیئے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر پر روانہ ہونے لگتے تو دعا کرتے :۔

اَللّٰھُمَّ إِنَّا نَسْئَلُکَ فِیْ
سَفَرِنَا ھٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰی
وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰی
اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ عَلَیْنَا سَفَرَنَا
ھٰذَا وَاطْوِ لَنَا بُعْدَہٗ
اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی
السَّفَرِ وَالْخَلِیْفَۃُ فِی
الْاَھْلِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ
بِکَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ
وَکَاٰبَۃِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ
الْمُنْقَلَبِ فِی الْاَھْلِ
وَالْمَالِ۔

ترجمہ: اے اللہ! ہم تجھ سے اِس سفر میں نیکی، تقویٰ اور تیرے ہاں پسندیدہ اعمال کی توفیق چاہتے ہیں۔ اے اللہ! اِس سفر کو ہم پر آسان کر اور اس کی لمبائی اور کوفت کو ہمارے لئے ہلکا کر دے۔ اے اللہ! تو ہی سفر میں ہمارا ساتھی و مددگار ہے اور ہمارے پیچھے اہل و عیال کا تو ہی نگران اور ان کی خبر گیری کرنے والا ہے۔ اے اللہ! ہم سفر کی تکالیف، رنجیدہ نظاروں اور اپنے پیچھے اپنے اہل و عیال اور مال میں خسارہ کے برے منظر سے تیری ہی پناہ چاہتے ہیں۔"

اس دعا کے اجزا پر علیحدہ علیحدہ جتنا غور کیا جائے اتنا ہی اس کی جامعیت نمایاں ہوتی ہے۔ اللّٰھم صلّ علی النبی و آلہٖ وسلم ۔

(ابو العطاء جالندھری)

غزل

...... (سعید بٹ)

جنوں سے بے نیاز تھا مگن تھا اپنے حال میں
وہ رات تھی فراق کی جو کٹ گئی ملال میں

بسا ہوں میں بھی کیا صنم کبھی تیرے خیال میں
شکایتیں ہزار ہیں اگرچہ اس سوال میں

منا لیا ہمیں کسی نے جب گلے لگا لیا
بہار ہی تو آ گئی جنوب میں شمال میں

شاید کہ میری داستاں میں رنگ تھا بہار کا
خزاں بھی تو آ گئی۔ تبھی تو ہے زوال میں

جو بس گئے ہو مستقل تمہیں میرے خیال میں
مزا نہیں رہے گا اب وہ لذتِ وصال میں

جمیلہ ہاشمی

غالب کا احتراق (اگزیما)

اگر ہم مرزا غالب کے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں جہاں ان کی بلند پروازیاں اور خیالی آرائیاں نظر آتی ہیں، وہاں ان کے بعض اشعار محض کسی طرز میں ذہنی مشق کا نتیجہ معلوم دیتے ہیں۔ بلکہ وہ ان کے ایسے احساسات کے ترجمان ہیں جو ان کی خارجی زندگی سے پیدا ہوئے اور شاعر نے ان کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور اس کے دل پر ایک گہرا نفسی اثر پیدا کیا ہے۔ دوسری طرف غالب کے خطوط اگرچہ ان کی زندگی کی مکمل غمازی نہیں کرتے۔ کیونکہ ان پر ان کی فطری ظرافت اور شوخی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ تاہم ان کے قنوطی ماحول کے چند نقوش ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں۔ غالب نے مکتوب نویسی میں نہ صرف دلی تجربات کا اظہار کیا ہے بلکہ اپنے عوارض اور روزمرہ کے معمولی واقعات کو بھی نہایت صراحت سے بیان کیا ہے۔ اور زندگی کا بے ڈھنگا پن، بوالعجبی اور زندگی کی حماقتوں کی بھی دل کھول کر نقاب کشائی کی ہے۔ غالب کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک سپاہی ہیں۔ ان کی فطرت میں ہمت اور امید ہونی چاہیے تھی لیکن ان کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "غم پسند" تھے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ غم سے مغلوب ہو گئے۔ ان کے برعکس بے شک انہوں نے غم کو معشوق نہیں بنایا بلکہ غم کو حیات بخش زندگی بنانے کیلئے مفکرانہ تجزیہ کیا ہے۔ اور فکری توازن کو برقرار رکھتے ہوئے غم کا شکار نہیں ہوئے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ غالب کا ماحول اور ان کے ذاتی حالات بھی غم انگیز تھے۔ غالب کی خلوت کی نمایاں تصویر خود ان کے خطوط پڑھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ مرزا غالب کو جہاں اولاد کا غم تھا وہاں پنشن نہ بحال ہونے کا رنج، خرچ اخراجات کی کمی اور ہمعصروں کی طرف سے بے قدری بلکہ مخالفت کا رونا بھی ہے اور سب سے بڑھ کر چند ایک جسمانی عوارض کا بھی ذکر ملتا ہے جن میں سے دو سال متواتر احتراق یا اگزیما سے وہ بستر علالت پر دراز رہے۔ چنانچہ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں بیماری کی کیفیت کس وضاحت سے کرتے ہیں:۔

"برس دن سے فساد خون کے عوارض
میں مبتلا ہوں۔ پھوڑہ اور دام میں گرفتہ
رہا ہوں۔ برس دن میں اوجاع سہتے سہتے
روح تحلیل ہو گئی۔ نشست و برخاست
کی طاقت نہ رہی۔ اور پھوڑے تو نہیں
مگر دونوں پنڈلیوں میں ہڈیوں کے
قریب دو پھوڑے ہیں۔ کھڑا ہوا
اور پنڈلیوں کی ہڈیاں چرخانے لگیں اور

رگیں پھٹنے لگیں۔ بائیں پاؤں پہ ورم،
کفِ پا سے جہاں وہ پھوڑا ہے پنڈلی
تک ورم۔ رات دن پڑا رہتا ہوں
..... اسی صورت سے روٹی کھاتا
ہوں ...... الخ

یہی نہیں بلکہ اس بیماری کا کئی اور خطوں میں بھی ذکر
ہے اور ایک ایک پھوڑے کا بڑی تفصیل اور تواتر سے
ذکر ہے لکھتے ہیں :۔

"پھوڑا اور ورم مرضِ خاص اور
رنجِ عام یہ ایک اجمالی دوسرا اجمالی
سنو ..... صعوبت کو تصور
کرو۔ ایک پھوڑا داہنے پہونچے میں
جس کو ساعد کہتے ہیں۔ دو پھوڑے
بائیں پہونچے میں یہ سہل ہیں ۔ بائیں
پاؤں میں کفِ پا و پشتِ پا سے لیکر
آدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی
سخت محللات و رادعات سے کچھ
نہ ہوا۔ اب تجویز ہے کہ نیب کا بھرتہ
باندھئے۔ جب پکے پھوٹے تب مرہم
لگائیے۔ کہو جب کفِ پا میں جراحت
کا عمل ہوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا؟"

پھر اس انگڑ میا کا انہیں بے حد غم تھا۔ بلکہ یہ ان کی روح
کی غذا بن گئی تھی :۔

"رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر
کاٹا۔ آئندہ خدا رزاق ہے۔ کچھ اور
کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس ایک چیز
کھانے کو ہوئی۔ اگرچہ غم ہی ہو تو پھر
کیا غم ہے؟"

پھر یہ غم "کئی ایک" داغوں" کی صورت میں میرزا غالب
کی روح و قلب پہ نمایاں ہوگئے" اس چھیاسٹھ برس میں
جہاں ہزار داغ ہیں ایک ہزار ایک سہی" ظاہر ہے کہ
کئی ایک شعروں میں بھی اسی کا اثر غالب ہے ؎

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا
دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

پھر کہتے ہیں ؎

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں اک داغِ نہاں اور

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں۔ نہ اقامت کی تاب ہے

اس ناہنجار مرض کی شدت اور اذیت اس درجہ
ناقابلِ برداشت تھی کہ مرزا غالب کہتے ہیں :۔

"سالِ گذشتہ مجھ پہ بہت سخت
گذرا - ۱۲ - ۱۳ مہینے صاحبِ فراش
رہا۔ اٹھنا دشوار تھا چلنا پھرنا کیسا؟
نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ
لقوہ، ان سب سے بدتر ایک صورت

بُرگ کدورت یعنی احتراق کا مرض مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے ہر پھوڑا ایک زخم۔ اور ہر زخم ایک غار ـــــ ہر روز بلا مبالغہ ۱۲-۱۳ پھائے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ تو دس مہینے سے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گذری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اُٹھی۔ جاگ اُٹھا۔ تڑپا کیا۔ پھر سو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔ ..... اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی .... الخ"

ظاہر ہے کہ اس کرب و آلام کے عالم میں اشعار میں اگر "زخم"، "کفِ پا"، "بے خوابی"، "مرہم"، "لہو"، "تپش"، "جراحت"، "سوزش" وغیرہ الفاظ آئیں تو وہ شاعر کی لاشعوری کیفیات کے غماز ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بیادِ گرمیِ صحبت برنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکر غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی

ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں۔ اصل صاحبِ فراش میں ہوں ..... پاؤں پر ورم ہو گیا ہے۔ کفِ پا و پشتِ پا سے نوبت گذر کر پنڈلی تک آ گئی ہے۔ جوتے میں پاؤں سماتا نہیں۔ بول و براز کے واسطے اُٹھنا دشوار۔ یہ سب باتیں ایک طرف درد محلل روح ہے ..... ستر برس کی عمر جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا۔" ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

یوں تو غالب کی زندگی میں ابتدا سے آخر تک

بے اطمینانی کی ایک لَے پائی جاتی ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ اس کی وجہ ان کے ماحول یا افتادِ زندگی سے بے اطمینانی ہے لیکن خود غالب کے قول کے مطابق ان کو دو تین چیزوں کی ضرور شکایت رہی ہے۔ ایک تو ان کی ادبی کوششوں کی نا قدری دوسرے ان کی مالی مشکلات۔ اسی لئے وہ ساری زندگی کڑھتے رہے اور ان کے اشعار میں بھی اس بے اطمینانی کی جھلک نظر آتی ہے ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس پر مستزاد یہ کہ ڈیڑھ دو برس اگر بیماری سے صاحب فراش ہو گئے۔ زندگی اجیرن ہو گئی۔ "زخم" "سوزش" "داغ" "آبلے" اور "خون" شعروں کے سانچے میں ڈھل گئے ؎

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

دوستِ غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یا رب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

حتیٰ کہ اس بیماری نے غالب کو ایسا تنگ کیا کہ بعض اوقات وہ مایوسی کی حد تک پہنچ پہنچ گئے :-

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے ان "اورام و ثبور" کے علاج کے لئے بھی بہت تگ و دو کی ہے ؎

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

[illegible]

ملک منصور احمد عمر
سال اوّل۔ (سائنس)

یہ آنسو! ـــــ یہ تڑپتے دل کی فریاد!

"امّاں! یہ آپ کی آنکھوں میں کیا ہے؟" ننھے بیٹے نے معصومیت اور تعجب کے ملے جلے انداز میں ماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں زاہد!" ماں نے بیٹے کو بہلاتے ہوئے کہا۔

"ہائے بتاتی کیوں نہیں امّاں!" بیٹے نے اصرار کیا "کچھ تو آپ کی آنکھوں میں ہے یہ پانی سا۔"

"یہ آنسو ہیں بیٹا!" ماں نے بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمی، بہت دھیمی آواز سے کہا۔

"وہ آنسو کیا ہوتے ہیں امّاں؟" بیٹے نے پوچھا۔

"بیٹا! یہ تڑپتے دل کی فریاد ہوتے ہیں" ماں نے اشکبار آنکھوں سے کہا۔ "یہ روتے دل کا سیلاب ہوتے ہیں۔"

"ہاں تو پھر آپ اس مٹی کے ڈھیر کے ساتھ کیوں کھوئی بیٹھی ہیں" بیٹے نے ایک اور سوال کیا۔

"یہ مٹی کا ڈھیر نہیں پیارے بیٹے! یہ تمہارے ابا کی قبر ہے" ماں نے رونے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "آج سے پانچ سال قبل جب تم ایک سال کے تھے تو تمہارے ابا ہم سے روٹھے اور ہمیشہ کیلئے ہمارے دل دُنیا کے کانٹوں سے چھلنی ہونے کیلئے چھوڑ گئے۔ اُس وقت سے بیٹا! میں تمہیں ساتھ لئے در در کی ٹھوکریں کھاتی آرہی ہوں۔ میرے چاند! میں تمہیں ایک کانٹا چبھنا گوارا نہیں کر سکتی مگر اپنی جان قربان کر سکتی ہوں۔"

"تو ہمارا گھر ہے تو سہی امّاں!" زاہد نے نہایت بھولے پن سے کہا۔ "کتنا شاندار مرمر کا ہے اُوپر سے۔ پردے بھی تو اندر لگے ہوئے ہیں اور پھر ہماری خالہ جان بھی ہیں کتنی اچھی ہیں وہ۔"

"نہیں میری جان! یہ گھر ہمارا نہیں ہے اور یہ جو خالہ جان ہیں انہوں نے تمہارے ابا کے داغِ مفارقت دیتے ہی ہمیں رکھ لیا تھا۔ میں گھر کا کام کرتی ہوں اور تمہارا اور اپنا پیٹ پالتی ہوں بیٹا! تم نے دیکھا نہیں ہے کہ خالہ جان تو سارا دن پلنگ پہ بیٹھی رہتی ہیں اور سارا باورچی خانہ کا کام میں کرتی ہوں، تینوں وقت کا کھانا پکانا ہوتا ہے۔ پھر بچوں کے کپڑے دھونے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ رات کو خالہ جان کو دبانا بھی ہوتا ہے۔ تب جا کر کہیں مہینے کے دس روپلے ملتے ہیں۔"

"دس روپلے امّاں! ـــــ؟" بیٹے نے معصومیت سے پوچھا۔ "تو پھر آپ اتنے پیسے کیا کرتی ہیں؟ مجھے بھی تو دیں۔"

"دس روپوں میں تمہارے اور اپنے کپڑے سلواتی ہوں۔ اور تمہارے لئے کبھی کبھی شربت بھی تو لاتی ہوں" ماں نے جواب دیا۔

"اچھا زاہد اب یہاں بیٹھے بہت دیر ہو گئی ہے چلو چلتے ہیں۔ دیکھو سورج غروب ہونے کو ہے۔ میں نے ابھی جا کر رات کا کھانا بھی تو تیار کرنا ہے۔"

ماں اور بیٹا دونوں قبر سے اُٹھتے ہیں اور گھر کی راہ لیتے ہیں۔ راستے میں ماں کے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ جاتا ہے۔ وہ کانٹا نکالنے کے لئے ایک لحظہ کیلئے ٹھہر جاتی ہے۔ زاہد بڑی معصوم اور دھیمی نگاہوں سے ماں کی تکلیف کو جانچتا ہے۔

لپٹتا ہے اور کہتا ہے "اماں! آپ ایک جوتی کیوں نہیں خرید لیتیں میرے جوتے بھی تو ٹوٹے ہیں۔ دیکھیں آپکے پاؤں سے خون بہہ رہا ہے۔"

"بیٹا جیتے رہو!" ماں نے روتے ہوئے کہا۔ "جب تمہارے ابا زندہ تھے تو میری کبھی ایسی تنگدستی ہوا کرتی تھی۔ اسوقت کبھی میری آنکھوں نے بارش نہ برسائی تھی بیٹا! اسوقت تم بھی ایسے حال میں نہ ہوتے تھے۔ تم اسوقت کتنے چھوٹے تھے اور وہ تمہیں کتنا پیار کرتے تھے۔"

یہ غمزدہ ماں اور بیٹا گھر پہنچتے ہیں۔ اور گھر میں قدم رکھتے ہی مالکن (خالہ جان) ان پر برس پڑتی ہے "کہاں مر گئی تھی آج پھر تم۔ کیوں آج بیٹے کو دور کی سیر کرانے کو دل چاہا تھا۔ بھول گئی تھی کہ ابھی رات کا کھانا بھی پکانا ہے جتنا تمہارا لحاظ کرتے ہیں اتنا ہی سر پہ چڑھتی جا رہی ہو۔ یاد رکھنا آئندہ اگر دیر ہوئی تو تنخواہ سے پیسے کٹ جائیں گے۔ ہم برداشت نہیں کر سکتے کہ تم روزانہ خاوند کی قبر پر جا کر گھنٹوں وقت ضائع کرو۔ آئندہ خیال رہا ورنہ تیرے زاہد کا مستقبل بھی روشن نہیں ہوگا۔"

جوں جوں دن گزرتے گئے زاہد اپنے اصل حالات سے واقف ہوتا گیا۔ ماں اور بیٹا کبھی کبھی قبر کی زیارت کو چلے جاتے۔ انکی تکالیف بڑھتی گئیں اور پیار ان کانٹوں کو پھولوں کی مانند سمجھ کر سہتے چلے گئے مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

جب زاہد پندرہ برس کا ہوا تو مالکن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جسے گھر میں منے کے نام سے پکارتے تھے۔ اس بچے کے پیدا ہونے کا زاہد پر بھی اثر پڑا۔ اسے سارا دن منے کی دیکھ بھال کرنی ہوتی۔ غریب ماں باورچی خانہ میں مصروف ہوتی تو زاہد منے کی نگہداشت کرتا۔ غمزدہ ماں خود تو سارا دن کام کرتی اور زبان پر شکوہ کا لفظ نہ لاتی لیکن بیٹے کی تکلیف بھلا ماں کی ممتا کب گوارا کر سکتی تھی۔ بیٹے کے اس غم نے ماں کے زخموں پر نمک کا کام دیا اور وہ سارا دن اسی فکر میں سرگرداں رہتی کہ کہیں میرے بیٹے کو آرام میسر ہو لیکن آخر اس گھر کو چھوڑے بغیر آرام میسر ہو بھی کیسے سکتا تھا اور وہ اس گھر کو چھوڑنا بھی نہ چاہتی تھی۔ آخر ماں بیٹے کو پیٹ تو پالنا ہی تھا۔ ان کا کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہ تھا جو ان کی ڈھارس بندھاتا اور سہارا بنتا۔

ایک دفعہ زاہد منے کو بہلانے کے لئے باہر لے گیا۔ اتفاق سے اس کا گہرا اور بے تکلف دوست بشیر آتا نظر آیا۔ دور ہی سے کہنے لگا "کیوں زاہد کیسے ہو؟"

"خدا کا شکر ہے" زاہد نے کہا "تم تو اچھے ہو؟"

"بھئی میں تو اپنا حال بعد میں بتاؤں گا پہلے ٹھیک ٹھیک تمہارا حال تو جانوں" بشیر نے چنداں خفا ہوتے ہوئے کہا۔

"سن رکھو زاہد! ساتویں مرتبہ ہے کہ تم مجھ سے بات چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ بتاؤ تو سہی بھلا مجھ سے بھی گہرا اور قریبی دوست تمہارے یہاں اور کون ہے؟ پھر تم مجھ سے ہر بات چھپاتے ہو۔ اس دفعہ تو لحاظ نہیں کرونگا۔ بات چھپانی ہے تو بتلا دیں۔ ساری عمر تم سے بولوں گا نہیں۔"

بشیر کے اصرار پر زاہد اپنا حال سنانے پر رضامند ہو گیا۔

"بات یہ ہے بھئی بشیر! کام دھام تو نہیں کیا۔ صبح کا کھانا چھوڑا اور پھر رات کا۔ باقی وقت خالہ جان سے گپیں لگاتے گزر جاتا ہے۔ گھر میں ذرا جی گھبرایا تو منے کو لیکر باہر کی سیر کو نکل آتے ہیں۔ قصہ مختصر خدا کا شکر ہے اچھی گزر رہی ہے۔ تو سن لیا تم نے۔"

"آج پھر تم نے ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ میرا دل تو چاہتا ہے کہ ساری عمر کے لئے تمہاری نظروں سے غائب ہو جاؤں اور تم سے کبھی نہ بولوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خالہ جان کی اتنی قدر کیوں

کرتے ہو۔ وہ اوپر سے تمہیں پیٹ رہی ہوتی ہے اور نیچے سے تم کہہ رہے ہوتے ہو، خدا کا شکر ہے۔"

"بشیر! تم جانتے نہیں شاید" زاہد نے کہا "یہ وہی تو خالہ جان ہیں جنہوں نے میرے والد کے مرنے کے بعد مجھے اور میری ماں کو پالا۔"

"ہاں تو کچھ کر ڈالو نہ" بشیر نے کہا۔

"جیسے بھی ہیں پالا تو ہے" زاہد نے کہا "بھلا کون کسی کا ہوتا ہے"

"میں سب کچھ جانتا ہوں زاہد!" بشیر نے کہا "تین سال بڑا ہوں میں تم سے عمر میں۔ جب تمہارے والد فوت ہوئے وہ بھی مجھے یاد ہے اور جب تم اور تمہاری ماں اِس گھر کی نوکری کرنے لگے وہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ مگر صرف اتنا ہے کہ تم ہماری بات نہیں مانتے۔ خدا کی قسم آج ہی تم دونوں اِس گھر کو خیرباد کہو۔ پھر دیکھنا اگر تمہیں کوئی تکلیف ہونے دی تو۔"

"یہ ٹھیک ہے سب کچھ پیارے دوست!" زاہد نے ذرا دھیمی آواز سے کہا۔ "لیکن ...."

"لیکن ویکن کچھ نہیں" بشیر نے بات کاٹتے ہوئے کہا "سُن لو آج کے بعد تم میرے سامنے اپنی خالہ جان کی کوئی تعریف نہ کرنا۔ ورنہ ...."

"ورنہ کیا ـــــ؟ تم ہم سے بولنا چھوڑ دو گے؟" زاہد نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو زاہد!" بشیر نے بڑے پیار سے کہا "بھلا میں تم کو چھوڑنے لگا ہوں؟ میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔"

اتنی بات کہہ کر بشیر زاہد سے لپٹ کر خود بھی رونے لگ جاتا ہے اور بہت دیر تک بشیر اپنے غریب دوست کی دلجوئی کی خاطر اس کے آنسوؤں کو اپنے رومال سے پونچھتا ہے اور پھر کچھ نقدی اُس کی طرف پیش کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ جیب میں ڈال لو زاہد! اور میرا خیال ہے جلدی سے گھر چلے جاؤ۔ دیکھو ننھا بھی مٹی سے کھیل رہا ہے۔ مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ کہیں خالہ جان بگڑ نہ جائیں۔"

"پہلے بھی تو آپ کئی دفعہ پیسے دے چکے ہیں" زاہد نے کہا۔ "آپ بھلا کیوں اتنی تکلیف کرتے ہیں!"

اس کے بعد بشیر اپنے گھر کی طرف اور غریب زاہد ننھے کو اٹھائے اپنی خالہ جان کے گھر کی راہ لیتا ہے۔

خالہ جان جو پہلے ہی سے دروازہ میں غضبناک حالت میں منتظر تھیں اپنے ننھے کو مٹی لگے دیکھ کر اور سٹ پٹائیں اور ننھے کو پکڑ زاہد کو اتنا پیٹا کہ خدا کی پناہ۔ غریب زاہد اپنی سسکیوں کو دباتے ہوئے آنسو بہاتا ایک کونے میں چلا جاتا ہے اور کافی دیر تک چپکے چپکے روتا رہتا ہے۔ نہ جانے کیا؟ پھر دوسرے کام کے لئے آواز پڑتی ہے تو جی! اچھا! کہتا ہوا حاضر ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ بہت کام کی وجہ سے اس کی ماں کو تھوڑا سا بخار ہو گیا۔ وہ بیچاری آرام کیلئے چارپائی کے قریب جانے لگی کہ خالہ جان کی گرجدار آواز اس کو دوبارہ کام پر بلا لیتی۔ اس طرح سے اس کا بخار بجائے گھٹنے کے بڑھتا شدت اختیار کر گیا۔

"اماں! ـــــ کیا حال ہے؟" زاہد نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"پیارے بیٹے!" ماں نے دھیمی آواز سے کہا اور پھر اس کی زبان رک سی گئی۔ اس نے مزید بولنے کی سعی کی لیکن آواز نہ نکل سکی۔

"جی اماں! ـــــ" روتے بیٹے نے کہا جس کے آنسوؤں نے کپڑوں کو پانی کی طرح گیلا کر دیا تھا۔

اس بیمار ماں نے ایک لحظہ کیلئے آنکھیں کھولیں اور اپنے دونوں

پُرملال بیٹے کے چہرہ پر آخری نظر دوڑاتے ہوئے بولی "میرے پیارے! میرے نازوں پالے بیٹے! اے مجھے جان سے عزیز اور ایک رُوٹھنے والے کی یادگار! میرے بعد غمگین مت ہونا۔ جس طرح پہلے ہمیشہ تم نے صبر دکھایا اب بھی خدا کیلئے....."

ڈاکٹر کے آنے سے قبل ہی اس کی زبان بند ہو گئی۔ اسکی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو گئیں۔ زاہد کے ناز اُٹھانے والی ماں زندگی بھر کے لیے اس سے رخصت ہو گئی۔

زاہد اپنی ماں کی لاش سے لپٹ کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ بے اختیار اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔

اسی روز زاہد کے غمزدہ اور بھٹکے کاندھوں نے ماں کی لاش کو باپ کی قبر کے ساتھ دفن کیا۔ اب تو زاہد کو ماضی کی یاد دلانے کیلئے دو یادگاریں تھیں۔ تدفین کا کام کرتے ہوئے شام ہو گئی۔ زاہد اور بشیر کے خاموش اور اداس قدم گھر کی طرف اُٹھے۔ راستے کی خاموشی کو بشیر نے توڑا۔ "پیارے زاہد! اب تو ہمارے گھر آجاؤ۔ تم مجھے بھائیوں سے زیادہ عزیز ہو۔"

"مجھے تمہارے اخلاص کی قدر ہے میرے اچھے ساتھی! تم ناراض نہ ہونا مجھے اپنی خالہ جان کے گھر ہی رہنے دو" زاہد نے جواب دیا "مجھے اجازت دو کہ میں بھی اُسی گھر میں اپنی جان دوں جہاں میری غریب ماں نے دم توڑا۔ میں ساری عمر کیلئے تمہارا ممنون ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ تم نے زندگی بھر میرا ساتھ دیا۔"

"اب میں مرتے دم تک تمہارا ساتھ دوں گا پیارے زاہد!" بشیر نے کہا۔ "تمہیں اگر پہلے گھر سے ہی محبت ہے تو میں تمہاری آرزو مٹانا نہیں چاہتا۔ تم جہاں چاہو رہو۔"

زاہد اپنی ماں کو موجود نہ پا کر اکثر آنسو بہایا کرتا۔ وہ ہمیشہ کیلئے اُداس ہو گیا۔ وہ اکثر خاموش رہتا اور بہت کم بات کرتا۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ غریب حال میں تھا۔ جب کبھی اسکی خالہ جان اس پر کوئی ظلم کرتیں تو اس کو اپنی ماں کے ناز یاد آ جاتے مگر پھر بھی وہ ماں کی مرتے وقت کی نصیحت پر عمل کرتا اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتا۔ وہ اکثر بشیر کے ہمراہ ننھے کو ساتھ لیے یا اکیلا ہی دونوں قبروں کی زیارت کو جایا کرتا اور گھنٹوں وہاں بیٹھا آنسوؤں کی بارش برساتا رہتا۔

ایک دفعہ وہ ننھے کو ہمراہ لئے اپنی غریب ماں کی قبر پر پہنچا اور بیٹھ کر ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ اس کی اشکبار آنکھیں دیکھ کر ننھے نے بڑی معصومیت سے زاہد سے پوچھا۔

"بھیا! یہ آپ کی آنکھوں میں کیا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں ننھے!" زاہد نے ننھے کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"ہائے بتاتے کیوں نہیں بھیا!" ننھے نے اصرار کیا "کچھ تو آپ کی آنکھوں میں ہے یہ پانی سا۔"

"یہ آنسو ہیں ننھے!" زاہد نے درد بھری آواز میں ننھے کو بہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ آنسو کیا ہوتے ہیں؟" ننھے نے پوچھا۔

"ننھے! یہ تڑپتے دل کی فریاد ہوتے ہیں" زاہد نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "یہ روتے دل کا سیلاب ہوتے ہیں۔"

"ہاں تو پھر آپ اس مٹی کے ڈھیر کے ساتھ کیوں لپٹ کے بیٹھے ہیں؟" ننھے نے ایک اور سوال کیا۔

"یہ مٹی کا ڈھیر نہیں پیارے ننھے!" زاہد نے ننھے کو گود میں بٹھاتے ہوئے کہا "یہ میری غریب ماں کی قبر ہے جو ہمیشہ کے لئے میرا دل دنیا کے کانٹوں سے چھلنی ہونے کے لئے چھوڑ گئی۔" ☆

تأثرات

(بقیہ صـ۲)

اُن کے قد اور عمر نے میری توجہ کو زیادہ جذب کیا ہے، آخر یہ کالج ہے فوجی اکیڈمی تو ہے نہیں کہ عمر یا قد و قامت کی کچھ قید ہو چنانچہ اگر قد اور عمر کے لحاظ سے ہر کلاس کا گراف کھینچا جائے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا صورت اختیار ہو؟ یہ اس سال کی خصوصیت نہیں ہر سال یہی ہوتا ہے مگر آزادی یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ زیادہ تیزی آ گئی ہے۔ ازل سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے، ابد تک یہی سلسلہ جاری و ساری رہیگا ہم عمر اور ہم قد "سٹوڈنٹ" فراہم کرنا مشکل امر ہے! پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ربط ضبط ہوتا ہی ہے۔ مگر اس مرتبہ اس گراف کے Co-Ordinates بڑے عجیب و غریب ہیں۔ اس کی تکمیل خواجہ دل محمد صاحب کے علاوہ اور کسی سے نہیں ہو سکے گی۔

مجھے ہر چھوٹی اور بڑی چیز پر غور کرنے کی بُری عادت ہے۔ اس مرتبہ میں نے کلاسوں کی آمد و رفت کا جب غور سے جائزہ لیا تو سانس رُک گئی! ؏

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

فلک نے کیا نظارہ دکھایا! طلبہ میں معقول تعداد "اطفال" کی، اکثریت "خدام" کی اور رجال بلکہ "انصار اللہ" بھی پڑھتے ہیں!۔ سالانہ امتحان میں یہ نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ہر عمر اور ہر طبقہ کی نمائندگی ہوتی ہے مگر اب تو کلاسوں کا یہی حال ہے۔ زیادہ تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تھرڈ ایئر کے ایک صاحب ہیں، عقلی لحاظ سے ان کا صاحبزادہ فورتھ ایئر میں ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اور بہت سے احباب فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر میں موجود ہیں جو "تعلیم بالغاں" کا ایمان افروز نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اور زبانِ حال سے یہی کہہ رہے ہیں ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو "فرسٹ ایئر" میں کٹ گئے دو "سالِ دوم" میں

یونیفارم نے اور بھی رنگ چڑھایا ہے۔ کالج نے بعض طلبہ کو نسوانیت عطا کی ہے اور بعض کو کارٹونوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ یونیفارم مجھے دل سے پسند ہے ــــــ مجھے ہی نہیں بلکہ سب کو پسند ہے!!

"ذکرِ میکدہ ــــــ"

تک شاپ کے دروازے آج بھی ہر خاص و عام کے لئے وا ہیں! اور عقیدت مندوں کے اژدہام سے اکثر "عرس" کی کیفیت رہتی ہے۔!

میں کہہ آیا ہوں کہ کالج کے پرانے لوگ بڑے عجیب تھے! ایک طرف ملنسار تو دوسری طرف وضعدار اور تیسری طرف بڑے زندہ دل! اس زمانے میں کالج "زرخیز" ہونے کے علاوہ "انجمن خیز" بھی تھا۔ "صالحین" کی بڑی بڑی انجمنیں آئے دن تولد ہوتیں! ڈرامائی ایکشن پورا کرنے کے بعد فوت ہو جاتیں مگر اب وہ بات نہیں، گویا کالج نے "ضبطِ تولید" کا ٹھیکا لگوا لیا ہے! پرانے لوگ انجمن سازی کی روایت اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں! وہ دن ہمیشہ کے لئے بیت چکے جب "بزمِ فکر" اور قسم کی خالص "اسلامی" اور "دینی" تحریکیں وقتاً فوقتاً اٹھا کرتی تھیں۔ پرانے لوگ اخبار بھی پڑھا کرتے تھے۔ گو لائبریری میں آجکل بھی ہجوم رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن غلطی سے ایک "بل" میرے ساتھ لائبریری میں چلا آیا مگر اس کو دیکھنے کے لئے کوشش کے باوجود جگہ نہ مل سکی! مگر آجکل اخبار پڑھنے والے "نئی روشنی" کے لوگ ہیں! وہ یہ کم پڑھتے

ہیں تصویریں زیادہ دیکھتے ہیں اور کئی میری طرح فقط ادویہ کے اشتہار ہی پڑھتے جاتے ہیں! مگر اِن گئے گزرے حجاب کا اخباری دنیا سے عملی تعلق ہوا کرتا تھا۔ مثلاً اگر وزیر تجارت اُن کے زمانے میں چائے نوشی کے خلاف اپیل کرتے تو مجھے یقین ہے کہ ٹکٹ شاپ کے عین مقابل ”انجمن انسدادِ چائے نوشی رجسٹرڈ“ کا دفتر کھل جاتا۔ بلکہ اس کی ایک شاخ ٹکٹ شاپ کے ”بطن“ میں ”دفتر اندرون“ کے نام سے کھل جاتی! وہ کتنے جذبے والے لوگ تھے! مگر اب تو یہاں آوے کا آوہ ہی خراب ہے۔ بلکہ سارے ”بلا نوش“ ہیں جو توبہ کے ساتھ ساتھ وزیر موصوف کی اپیل کو بھی گھول گھول کر پی رہے ہیں۔ تقریباً تمام کالجوں کا یہی حال ہے۔ خود ستائی معاف! راقم الحروف معقول حد تک رقیق القلب واقع ہوا ہے۔ یہ اللہ میاں کی دین ہے‘ اب اس میں میرا کیا قصور! چنانچہ وزیر صاحب کی اپیل غالب مرحوم کے محبوب کی نگاہ کی طرح دل سے جگر تک اُتر گئی۔ بلکہ دونوں کو اِک ادا سے رضا مند کر گئی۔ چنانچہ فوراً یہ عاجز چائے نوشی سے تائب ہو کر وزیر صاحب کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا!

چائے کے متعلق ایک مرحوم شاعر کا فتویٰ یہ ہے کہ ؎

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مگر ان پرانے بزرگوں کی قوتِ قدسیہ کچھ اتنی قوی تھی کہ اس کافر کا مسلمان ہونا یقینی امر تھا۔ مگر وہ عجیب و غریب لوگ لد گئے ——— اور ان کے ساتھ ان کی برکتیں اور عجیب حرکتیں بھی زمانے سے اٹھ گئیں

——— اب اُن سا مشتاقِ جمال ملنا ناممکن ———

؎

لاکھ ڈھونڈو گے چراغِ رخِ زیبا لیکر

غالب کا احتراق (اگزیما)

(بقیہ صفحہ ۳۲)

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوا کام نہیں آئی ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ہفت آسیا بجوش و ما در میانِ او
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ مے رود

مولانا حالی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مرزا غالب نے بیزاری و بے اطمینانی کا یہ میدان اپنے جوہرِ شعر کو چمکانے کیلئے جان بوجھ کر پسند کیا تھا لیکن خود غالب کی نظم و نثر کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ محض شوق و تفنن میں آہ و زاری اور بار بار اپنی غمگینی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ واقعی وہ اس بلا کی تلخی و الم کا شکار ہو گئے تھے۔

حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل

ساقئ کوثر کے حضور

سلامت رہے تیرا میخانہ ساقی
ہمیں بھی ملے ایک پیمانہ ساقی

ترا جا مندرا تری شاں میں آیا
قلوبِ اہلِ عالم کے پروانہ ساقی

میں اس عقل و دانش سے دنیا کی کیا لوں
بنا لے مجھے اپنا دیوانہ ساقی

تری چشمِ پُرفن کا جادو ہے ایسا
جسے دیکھو تیرا ہے مستانہ ساقی

پلٹ دی تھی دم بھر میں عالم کی کایا
نہ بھولے گی دنیا یہ افسانہ ساقی

جو مٹی کے مادھو تھے طائر بنے ہیں
یہ ہے مانتا اپنا بیگانہ ساقی

پریشاں ہیں گیسوئے اسلام کیا غم
سنوارے گا ان کو ترا شانہ ساقی

یہ مانی ہوئی بات بے غلّ و غش ہے
کہ دیوانہ تیرا ہے فرزانہ ساقی

فقیرانِ عالم ہیں احمدؐ کے پیرو
مزاج ان کا لیکن ہے شاہانہ ساقی

دعا ہے یہ دن رات اکمل کی دل سے
ابد تک رہے تیرا میخانہ ساقی

لطف الرحمٰن محمود

○

یہ کس جہاں میں جنوں آج لا رہا ہے مجھے
کہ ہر ستم پر ترے پیار آ رہا ہے مجھے

تری نگاہ میں کچھ التفات سا پا کر
خیالِ ترکِ محبت ستا رہا ہے مجھے

ذرا فریبِ محبت پہ مسکرانے دو!
تمہارا حُسنِ نظر گدگدا رہا ہے مجھے

تمہارے حُسنِ فسوں ساز کا کرشمہ ہے
تمہارے ہجر میں بھی لطف آ رہا ہے مجھے

جبینِ حُسن پہ داغِ وفا؟ معاذ اللہ!
یہ کون جھوٹا فسانہ سُنا رہا ہے مجھے

ذرا عجیب ہے لیکن مآل اچھا ہے
بڑے خلوص سے کوئی مٹا رہا ہے مجھے

شبِ فراق کے زانو پہ کس طرح محمود
خیالِ شہرِ نگاراں سُلا رہا ہے مجھے

مصلح الدین احمد راجکی مرحوم

○

تم کیا جانو اس الفت میں کیا رنج اٹھانے پڑتے ہیں
جو راز چھپانے ہوتے ہیں وہ راز بتانے پڑتے ہیں

ایسی بھی مصیبت آتی ہے اس دل کی لگی کے ہاتھوں سے
اپنوں کے علاوہ غیروں کے احسان اُٹھانے پڑتے ہیں

تم بھول کہو یا داغ انہیں لیکن یہ حقیقت ظاہر ہے
وہ زخم ہرے ہو جاتے ہیں جو زخم دکھانے پڑتے ہیں

فرقت کی سحر تو ہوتی ہے پر رات کے جانے جاتے تک
اشکوں کے ستارے آنکھوں سے رہ رہ کے گرانے پڑتے ہیں

یہ جانِ وفا یہ راحتِ جاں تو عام جنوں کے عنواں ہیں
کچھ نام تمہارے وہ بھی ہیں جو لکھ کے مٹانے پڑتے ہیں

آدابِ محبت کی خاطر اس بزمِ جہاں میں اے مصلح
ایسے بھی بہت سے گیت ہیں جو آنکھوں سے سنانے پڑتے ہیں

پروفیسر محمد شریف خالد ایم۔اے

عرصۂ زندگی نہیں عرصۂ کارزار ہے
شعلہ فشاں ہے حسن بھی عشق بھی اشکبار ہے

شبنم سا کیوں ٹکا نہیں آنچل پہ گل کے حیرت ہے
گیسو ہے تابدار گر، گوہر بھی آبدار ہے

لائی ہیں رنگ عشق کی آخر وفا شعاریاں
کر گئے جفائیں اپنی یاد، حسن بھی شرمسار ہے

وعدہ وفا ہوا نہیں وعدہ شکن سے آج تک
ہائے ہماری سادگی اس پہ بھی اعتبار ہے

آئیں گے وہ یہاں کبھی بیٹھے ہیں اس امید پہ
آ اے قاصدِ اجل، تیرا ہی انتظار ہے

عالمِ بے ثبات میں حاصل کسے بقا ہوئی
شان و شکوہ خسروی، تاج نہ تاجدار ہے

خالد نگاہیں بار بار اٹھتی ہیں کس لئے اُدھر
اُن کا شعار ہے یہی کس لئے انتظار ہے

مبشر احمد راجیکی

میرا ساجن میرا ساجن چلتا جادو ہنستا گلشن
لمبی لمبی اُس کی پلکیں تیکھی تیکھی اُس کی چتون
اُس کے گیسو رات سے کالے اُس کے عارض چاند سے روشن
مَن کی دولت کون چھپائے کس کو ملے گا ایسا رہزن
قدرت نے کیا جوڑ ملایا مَیں بھی بِرہن وہ بھی بِرہن
شعلہ تھا یا کوئی بجلی کس نے پھونکا میرا تن من
کس کو دکھاؤں دل کے پھپھولے ساری دنیا میری دشمن
لب تو میرے ہل نہ سکیں گے کون سنے گا دل کی دھڑکن
گردشِ دوراں دھیرے دھیرے چھوٹ چلا ہے اُن کا دامن
آہیں ہیں یا موت کے سائے آنسو ہیں یا اُس کے مدفن
جیون کا کچھ میل کٹے گا اور جلاؤ غم کا ایندھن
دنیا کی ہے ریت پرانی جس نے چاہا اُس کی دشمن

چھوڑ مبشر وصل کی آشا!
کٹ نہ سکیں گے ہجر کے بندھن

ملک عبدالباسط خادم
(سال چہارم)

اگر مجھ کو تجھ سے محبت نہ ہوتی
اذیت، مصیبت، ملامت نہ ہوتی
میں تجھ پہ فدا جان و دل سے نہ ہوتا
تجھے میرے دل پہ حکومت نہ ہوتی
جگر، تیرِ مژگاں سے گھائل نہ ہوتا
دلِ نیم جاں کی یہ حالت نہ ہوتی
تیری راہ میں میں بچھاتا نہ آنکھیں
تیری دید کی دل کو حسرت نہ ہوتی
میں گلیوں میں پھرتا نہ یوں چاک داماں
جنوں خیز یوں میری وحشت نہ ہوتی
خریدارِ اوّل اگر میں نہ ہوتا
ترے حسن کی کوئی قیمت نہ ہوتی
مجھے ہوتا معلوم انجامِ الفت
تو مجھ کو کبھی تجھ سے الفت نہ ہوتی
نہ ہوتے عدو تیری محفل کی زینت
مجھے باریابی کی حسرت نہ ہوتی
رقیبوں کے تجھ سے اشارے نہ ہوتے
بھری بزم میں مجھ کو خفت نہ ہوتی
غم و رنج، درد و فغاں، آہ و شیون
جدائی کی شب اِک قیامت نہ ہوتی
مجھے دید کا شوق خادم نہ ہوتا
تجھے خود نمائی کی عادت نہ ہوتی

ھادی مونس (بی۔ایڈ)
(اولڈ بوائے ٹی۔آئی۔کالج)

اے ٹی۔آئی کالج ....!

چٹانوں کے دامن کی اجلی فضا میں یہ ٹی۔آئی کالج کی رنگیں عمارت
حقیقی تعلّم کی وہ درسگاہ ہے بصد شوق کی جس کی میں نے عبادت
اسی کی محبّت بھری گود سے فیضیاب ہو کے نکلے ہیں دیں کے سپاہی
یہی ہے وہ منزل جسے دیکھتا ہے نگاہِ تعجب سے ہر ایک راہی
ترے فیض سے ہی اے ٹی آئی کالج انہیں مل چکی ہے رہِ استقامت
جنہیں سالہا سال سے نہ پتہ تھا کہ ہے زندگانی میں مضمر حلاوت
جہاں کی بیابانیوں میں عیاں تھی نہ عالم فروزی نہ خورشید گیری
وہاں سے میسّر ہوئی ہے ہزاروں بھٹکتے جوانوں کو روشن ضمیری

انور شاہ ارشد
سال سوم (آرٹس)

○

دریں ہنگامۂ محفل ہمہ را ہمزباں دارم
تو میدانی کہ از رنداں ہزاراں رازداں دارم

نہ سروِ گلستاں جویم نہ مہرِ باغباں خواہم
چوں در خلوت بود یارم بہارِ جاوداں دارم

چوں حسنِ جاوداں داری من عشقِ بیکراں دارم
من از رنگینیِ عشقِ تو رنگیں داستاں دارم

مرا آشفتہ سر گوید جہاں از بہرِ عشقِ تو
چہ غم دارم کہ در دل یادِ یارِ مہرباں دارم

رقیباں وصلِ او دارند و رنداں ساغر و مینا
منم کز راہ گم گشتہ نہ ایں دارم نہ آں دارم